Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1977

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی!

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کیلئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اسکے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور نہ کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کیلئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر دیدۂ بیدار پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

(معراجِ انسانیت - پرویز)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان ۱۸ روپے غیر ممالک ۳ پونڈ	ٹیلی فون نمبر ۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۱ ۱/۲ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	مارچ ۱۹۷۷ء	شمارہ ۳

فہرست

۱۔ لمعات ---------------- ۲

۲۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ---------------- ۵

۳۔ مودودی صاحب اور بارگاہِ رسالتمآب ---------------- ۹
(محترم پرویز صاحب کا جشنِ عیدِ میلادالنبیؐ پر خطاب) ----

۴۔ حقائق و عبر ۔۔ (۱) کارِ ماؔ فی سبیل اللہ فساد ! ---------------- ۴۵
(۲) مکاتبِ فکر کی ایک اور مثال ----------------
(۳) دے جا بابا، اللہ کے نام پر ! ----------------

۵۔ شہابِ ثاقب غروب ہو گیا ---- (محترم پرویز صاحب) ---------------- ۴۹

۶۔ نقد و تبصرہ ۔ (قائدِ اعظمؒ اور علمائے ہند) ---------------- ۵۳
(پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ----------------

۷۔ بزمِ مذاکرہ (قسط ۲) ---- (منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء) ---- ۵۷

ایڈیٹر: محمد خلیل ۔ ناشر: سراج الحق ۔ مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر: شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ: علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

جس وقت یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچے گا، جشنِ عیدِ میلادالنبیؐ کی مبارک و مسعود شمعیں ان کے قلوب کو مطلعِ انوار بنا رہی ہوں گی۔ اس تقریبِ سعید کی مناسبت سے ہم، ان لمعات کی ابتدائی سطور کو پرویز صاحب کے ایک نورافشاں خطاب (رحمتہ اللعالمینؐ) کے ابتدائیہ سے مزیّن کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے۔

"دنیا کی کسی قوم کو لیجئے۔ اس نے سال میں کچھ دن ایسے تجویز کر رکھے ہوں گے جنہیں وہ بطور قومی تیوہار منائے گی۔ قومی زندگی میں تیوہاروں کی تقریبات ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ تیوہار درحقیقت کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور اظہارِ جذبات (بشرطیکہ وہ آئین و ضوابط اور سنجیدگی و شرافت کی حدود سے تجاوز نہ کرے) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تیوہار عام طور پر کسی اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ جس واقعہ کی یاد میں کوئی قوم اپنا تیوہار مناتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے نزدیک زندگی کے مختلف عناصر کی اہمیت کا معیار کیا ہے۔ مثلاً ہندوستان کی ابتدائی آریہ قوم زراعت پیشہ تھی۔ اس لئے انہوں نے جہاں گنگا جمنا جیسے دریاؤں، بڑ اور پیپل جیسے درختوں کو اپنا دیوتا اور زمین (دھرتی) کو ماتا بنایا وہاں موسموں کے تغیرات کے اوقات (بسنت، ہولی وغیرہ) کو قومی تیوہار قرار دے لیا۔ اسلامی زندگی میں سب سے بلند اور عظیم مقام قرآنِ کریم کو حاصل ہے۔ اس لئے ان کے ہاں نزولِ قرآن سے زیادہ اہم واقعہ اور کونسا ہو سکتا تھا جسے ملّی تیوہار کی حیثیت حاصل ہوتی۔ اس ضمن میں خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ: قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ ھُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ (۱۰/۵۸)

"ان سے کہہ دو کہ (قرآن کا ملنا) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اس پر خوشیاں منائیں۔ یہ ہر اُس چیز سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔

قرآن اور صاحبِ قرآن کا تعلق

لیکن قرآن کے بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) اور نظری قوانین (THEORETICAL LAWS) کو ایک جیتے جاگتے عملی...... نظام کی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے پیش کیا۔ اس لئے نزولِ قرآن کی یاد منانے

کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی حیاتِ طیبہ کو بھی سامنے لایا جائے جس نے قرآنی حقائق کو محسوس پیکروں میں متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس نظام کے نتائج نوعِ انسانی کے حق میں کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہیں۔ ہمارے ہاں اس حقیقتِ کبریٰ کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضورؐ کے یومِ پیدائش کو بطور جشنِ مسرت (عید تیوہار) منایا جاتا ہے جسے عام طور پر عیدِ میلاد النبیؐ کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخ حضورؐ کے یومِ پیدائش سے متعین ہوتی یا یومِ وفات سے — واقعۂ ہجرت کی یاد میں ہوتی یا تکمیلِ دین کے اعلان کی مناسبت سے۔ میرے نزدیک اس سے اصل حقیقت پر کچھ فرق نہ پڑتا — نہ پڑ سکتا ہے۔ مقصود و مطلب بہرحال، قرآنی حقائق کی روشنی میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے۔ اگر ہم اس مقصد کے لئے اس تقریبِ سعید کو مناتے اور اس انداز و اسلوب سے آپؐ کی سیرتِ مقدسہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے، تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اگر ہم اب بھی اس تقریب کو اس انداز سے منائیں اور دنیا کے سامنے خالص قرآن کی تعلیم اور اس کی روشنی میں حضورؐ کی سیرت کو پیش کریں، تو میں علیٰ وجہ البصیرت دل کے پورے اطمینان سے، کہہ سکتا ہوں کہ پوری نوعِ انسانی اس تقریب کو منانے لگ جائے۔"

پرویز صاحب نے جو کہا ہے کہ اگر ہم حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو قرآنِ مجید کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کریں، تو پوری نوعِ انسانی اس تقریب کو منانے لگ جائے، تو اس میں انہوں نے ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ بہرحال اسی مواد سے مرتب کی جائے گی جو ہماری کتبِ احادیث، سیر اور تاریخ میں موجود ہے۔ لیکن ہماری انتہائی بدبختی ہے کہ ان کتابوں میں ایسی ایسی وضعی روایات بار پا گئیں جن سے حضورؐ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہو کر سامنے آتی ہے — یہ جو معاندینِ اسلام، آئے دن حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو ان کی بنیاد اسی قسم کی روایات پر ہوتی ہے۔ ہم ان معترضین کے خلاف تو دہائی مچاتے رہتے ہیں لیکن ان وضعی روایات کو بدستور سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کا کوئی عمل یا ارشاد قرآنِ مجید کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے آپ کی وہی سیرت صحیح اور قابلِ اعتماد قرار پا سکتی ہے جو قرآنِ مجید کی روشنی میں مرتب کی جائے۔ اس قسم کی مبارک کوشش پرویز صاحب نے کی اور ان کی کتابِ سیرت "معراجِ انسانیت" کو (بفضلہٖ تعالیٰ) بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

آجکل مودودی صاحب بھی ایک کتابِ سیرت مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ (جیسا کہ آپ اس مقالہ میں دیکھ چکے ہیں جو طلوعِ اسلام کی جنوری ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔) مودودی صاحب ان تمام روایات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جو کتبِ روایات میں درج ہیں۔ وہ ان میں سے صرف انہی روایات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جنہیں ان کی بصیرت صحیح قرار دے دے۔ روایات کے متعلق اس نظریہ کی رو سے توقع کی جا سکتی تھی کہ مودودی صاحب اپنی زیرِ ترتیب کتابِ سیرت میں ایسی روایات درج کریں گے جو قابلِ اعتراض نہ ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ اس وقت تک جس قدر حصہ اس مجوزہ

کتاب کا ترجمان القرآن میں شائع کر چکے ہیں، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چن چن کر وہی وضعی نقلیات اکٹھی کر رہے ہیں جن کی بنیاد پر معاندینِ اسلام اپنے اعتراضات کی بنیاد رکھا کرتے ہیں۔ پرویز صاحب، تحفظِ ناموسِ رسالت ؐ کے معاملہ میں (بالخصوص) بڑے حسّاس واقع ہوئے ہیں (اور ایمان بالرسالت کے ہر مدعی کو ایسا ہی ہونا چاہیئے) اس لئے مودودی صاحب کی اس نامسعود حرکت پر ان کا آئینۂ قلب چھلک اٹھا اور انہوں نے، عید میلادالنبیؐ کی تقریبِ سعید پر، جو ۲۷ر فروری کو ادارہ کے سبزہ زار میں منائی گئی، اسی موضوع کو اپنے خطاب کا عنوان قرار دیا اور تفصیل سے بتایا کہ مودودی صاحب کس قسم کی حضورؐ کی سیرت دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ خطاب چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ اس کا غور سے مطالعہ فرمائیے گا۔

(۲)

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ امسال عید میلادالنبیؐ کی تقریب بھی مارچ کے مہینے میں آرہی ہے اور یومِ پاکستان بھی اسی ماہ کی ۲۳ تاریخ کو۔ عید میلادالنبیؐ کی تو نظیر کائناتِ انسانیہ میں نہیں مل سکتی۔ یومِ پاکستان کی تاریخی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ اس مملکت کے حصول کا نقطۂ آغاز تھا جسے احیاءِ اسلام کے لئے طلب کیا جا رہا تھا۔ مسلسل جہد جہد کے بعد یہ مملکت تو مل گئی لیکن صدرِ اوّل کے بعد جو کچھ ہم نے اسلام کے ساتھ کیا، مملکتِ پاکستان کے حصول کے بعد، وہی کچھ اسلام کے ساتھ یہاں بھی ہوا۔ دنیا کی ستّر، اسّی کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں جس تکرار و اصرار کے ساتھ اسلام کا نام دہرایا جاتا ہے، ویسے ہی (بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ) یہاں اسلام، اسلام پکارا جاتا ہے لیکن جس طرح عملاً آج، اسلام، کسی ملک میں بھی کارفرما نہیں، اسی طرح اس مملکت میں بھی اس کی کارفرمائی نہیں ہوئی — کارفرمائی تو ایک طرف، اسلام کا صحیح مفہوم بھی کسی کے سامنے نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسلام کا صحیح تصوّر پیش کیا اور قائدِ اعظمؒ نے اس تصوّر کے مطابق مملکت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی۔ لیکن جس طرح ہم نے نفسِ اسلام کو مسخ کیا تھا اسی طرح یہاں اس تصوّر کا بھی حلیہ بگاڑا جا رہا ہے۔ اس عالمگیر جھکڑ میں مفکرِ قرآن (پرویز صاحب) کا دم غنیمت ہے۔ جو اپنی بساط کے مطابق، حقیقی اسلام کے حسین و تابدار رخِ روشن پر ڈالے ہوئے پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھانے میں مصروفِ تگ و تاز چلا آرہا ہے۔ عید میلادالنبیؐ کی تقریبِ سعید پر ان کا جو خطاب آپ کے سامنے آرہا ہے اس سے آپ دیکھیں گے کہ وہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ پر پڑے ہوئے ان نگاہ فریب پردوں کو کس حسن و خوبی سے اٹھا رہے ہیں۔ یومِ پاکستان کی تقریب پر ان کا ارادہ ہے کہ "قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجید" کے عنوان سے خطاب پیش کریں، اور آئندہ یومِ اقبالؒ پر حضرت علامہ کے تصورِ مملکت کی ایک جھلک وجہِ فروغِ دیدہ کریں۔

اور آخر میں، انتہائی مسرت انگیز خوشخبری یہ کہ پرویز صاحب کی چالیس سال کی محنتِ شاقہ کی ماحصل، معرکہ آرا تالیف، تبویب القرآن پریس میں چلی گئی ہے۔ یہ قریب پانچ پانچ سو صفحات کی تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ اندازہ ہے کہ اس کی طباعت قریب چھ ماہ کے عرصہ میں مکمل ہو سکے گی۔ وبیدہ التوفیق۔

طلوعِ اسلام کا مقصد اور مسلک

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہو رہی ہے، طلوعِ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ بھی تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض حلقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچا دی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے۔ جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے جس میں سہو بھی ہو سکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے ہم اس کے شکر گذار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآنِ کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ "طلوعِ اسلام" کہتا ہے اسے اس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے اس پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں ان پر حقیقت واضح ہو جائے، ہم طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اس مقصد و مسلک کو درج کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک یہ ہے کہ:-

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی رہنمائی کے لئے اُسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے واسطے ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب خدا کے آخری نبی و رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد

ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کیلئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جائے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اولوالامرِ مملکت اُمت کے مشورہ سے انجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ اُمور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا۔ اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکزِ ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائمقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی، یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڈمڈ ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی

احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اُمت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے، اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو، یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں، لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضورؐ نبی اکرم یا صحابۂ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں) نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ مخالفین کا گمراہ کن پراپیگنڈہ ہے۔

جو حضرات طلوعِ اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام ہے "بزمِ طلوعِ اسلام" جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں، ان سے نہ کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے نہ احکامِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے۔ نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ نہ وہ کسی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔ یہ ان متفق الخیال احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک لگنی و یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ۔ نہ ہی کسی قسم کی جلبِ منفعت۔

المختصر، مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوعِ اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ اس میں وہ قوم کے نوجوان تنظیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ تاکہ وہ مغربی سیکولرزم اور اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا.....؟

(۱) قرآنی معاشرہ میں ہر قسم کی عزت بلا تمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجاآوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوعِ انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

(۲) کوئی شخص بے کس و لاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی۔ اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا۔ اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحبِ اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف جھکا نہیں سکے گا۔

(۳) کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

(۴) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

(۵) ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

(۶) ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجتمندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا۔ بلکہ عندالضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

(۷) رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کیلئے کھلے رہیں گے تو کسی کیلئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(۸) ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں، اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جبر ہوگا نہ استبداد، نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔

(۹) ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد و بھروسہ ہوگا اور دھوکا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

(۱۰) یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ معاشرہ قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

تحریکِ طلوعِ اسلام، پاکستان میں اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوعِ انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے معاشرہ کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کیلئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرمائیے۔

باسمہٖ تعالیٰ

مودودی صاحب ـــــ اور ـــــ بارگاہِ رسالتمآب

پرویز صاحب کا خطاب

جسے اُنہوں نے، جشنِ عیدِ میلادُ النبیؐ کی تقریبِ سعید (۱۹۷۷ء)

پر ارزانی فرمایا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مودودی صاحب ـــــ اور ـــــ بارگاہِ رسالتمآبؐ

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

مَیں نے ایک بار، اِسی تقریبِ جانفزا و دلنواز کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اِسے حسنِ اتفاق کہیئے یا نظامِ فطرت کے عظیم پروگرام کی ایک حسین و شاداب کڑی کہ حضورِ نبی اکرمؐ کا ظہورِ قدسی جس ماہ (ربیع الاوّل) میں ہوا اس سے عربوں کے ہاں موسمِ بہار کا آغاز ہوتا تھا۔ یعنی اُس موسم کا آغاز جس میں ہر شاخِ خزاں دیدہ سے عروسِ زندگی از سرِ نو تبسم ریز و قہقہہ بار ہوتی ہے اور زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے گل پیرہن کیا جاتا ہے۔ اِس میں صحنِ چمنِ کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے اور شجرِ حیات کی ہر شاخ سے حسنِ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتا ہے۔ چٹیل میدانوں میں سبزۂ نورستہ اور خشک ٹہنیوں سے غنچۂ نودمیدہ آنکھیں ملتا ہوا اُبھرتا ہے اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ:-

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا (۳۰/۵۰)

تم مبداءِ فیض کی نیساں باریوں اور گہرفشانیوں کو دیکھو کہ اس نے کس طرح زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی ہے۔

یہ تھا وہ موسمِ بہار جس میں چمنِ رُشد و ہدایت کے اُس گلِ سرسبد (علیہ التحیۃ والسلام) کی نمود ہوئی جو عالمِ انسانیت کے لئے بہارِ تازہ کی نویدِ جانفزا اور حیاتِ نو کی نشیدِ دلنواز تھی۔ اِسی گلِ جنت نجیب کی حسین و شاداب یاد سے اپنے قلب و دماغ کو رشکِ صد فردوس بنانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کو اَلْمُدَّثِّر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (۷۴/۱) مادہ کے اعتبار سے، دَثْرٌ کے معنی ہوتے ہیں درختوں کا نئی نئی کونپلیں نکالنا۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں۔ دَثَرَ الشَّجَرُ دَثْرًا۔ درخت نے نئے نئے پتے نکال لئے اور اس کی سرسبز شاخیں پھیل گئیں۔ اس جہت سے اَلْمُدَّثِّر سے مراد ہوگی وہ ہستی جس کی آمد سے چمنِ عالم بہارِ نو سے ہمکنار ہونے والا تھا۔

وجہِ بہارِ کائنات

اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی ‏ ‏ ‏ ‏ جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

اور کارلائل اسی محیر العقول انقلاب کو اپنے شعلہ صفت خطیبانہ انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ:۔

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی تھی عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، ان کی طرف ایک پیغامبر آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی —— وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم ملت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے .... (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا) ایمان بہت بڑی قوت ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا۔ اس قوم کی تاریخ، ان کے اعمال میں صحیح نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب —— یہ محمدؐ —— اور صرف ایک سو سال کا عرصہ!

کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کی لپیٹ میں آ جائے۔

(حقیقت یہ ہے کہ) نوعِ انسان، خشک ریگستان کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسان کو شعلہ صفت بنا گیا! (HEROES AND HERO - WORSHIP)

(بحوالہ معراجِ انسانیت - ص ۴۰۲ - ۴۰۳)

کارلائل نے کہا ہے، اور بجا طور پر کہا ہے کہ یہ آنے والا اپنے ساتھ ایک آسمانی پیغام لایا جس نے نوعِ انسان کے خشک ریت کے ٹیلے کو، شعلہ صفت بنا دیا۔ لاریب یہ محیر انگیز انقلاب، اسی زلزلہ انگیز پیغام کا نتیجہ تھا لیکن یہ پیغام تو وحی کے ذریعے حروف و الفاظ کی شکل میں عطا ہوا تھا۔ اگر یہ الفاظ از خود اس قسم کا انقلاب پیدا کر سکتے تو خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ وحی پر مشتمل ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار دیتا، یا ان الفاظ کو کسی پہاڑ کی چٹان پر کندہ کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے، شروع سے یہ التزام رکھا کہ اپنی وحی کو منتخب افراد کے ذریعے دوسرے انسانوں تک پہنچایا۔ (جنہیں رسول کہا جاتا ہے) اور ان سے کہہ دیا کہ وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائیں اور اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں تاکہ ان کا یہ عمل دوسرے انسانوں کیلئے نمونہ کا کام بھی دے اور اس سے یہ حقیقت بھی مشہود ہو جائے کہ یہ پیغام ناممکن العمل نہیں۔ خدا کا یہ پیغام اپنی آخری اور مکمل غیر متبدل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے باقی رہا حضورؐ کا وہ عمل جسے قرآنِ کریم نے اسوۂ حسنہ کہہ کر پکارا ہے، اس کے متعلق ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا

اُسوۂ حسنہ

ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) تمہارے لئے رسول اللہؐ کی زندگی میں حسین ترین نمونہ ہے۔

اُسوہ نمونہ یا ماڈل کو کہتے ہیں۔ ڈرائنگ یا فائن آرٹس کے طلبا کے سامنے ان کا استاد یا پروفیسر ایک ماڈل رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے مطابق تصویر بناؤ۔ اب آپ سوچئے کہ اگر طلبا سے کہا جائے کہ وہ ماڈل کے مطابق تصویر بنائیں اور ماڈل ان کے سامنے نہ رکھا جائے تو وہ تصویر کس طرح بنا سکیں گے؟ یا اگر ہر طالب علم اپنے سامنے الگ الگ ماڈل رکھ لے تو ظاہر ہے کہ ایک کی تصویر دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔ ان میں سے ہر تصویر دوسرے سے مختلف ہوگی۔ اس مثال کے بعد یہ سوچئے کہ اگر اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو حکم یہ دے کہ اپنی سیرت کو سیرتِ محمدیہ کے ماڈل (قالب) میں ڈھالو اور وہ ماڈل ان کے سامنے رکھے نہیں، تو اس کا نتیجہ سوائے انتشار اور اختلاف کے کیا ہوگا؟ خدا نے جہاں یہ کہا کہ تمہارے لئے سیرتِ محمدیہ میں بہترین نمونہ یا ماڈل ہے تو اس کے ساتھ ہی سیرتِ محمدیہ کے نمایاں خط و خال خود قرآن مجید کے الہام میں محفوظ کر کے رکھ دیئے تاکہ ہر صاحبِ ایمان اور پوری کی پوری اُمت، اسی ماڈل کو اپنے سامنے رکھے۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند مستثنیات) تمام احکام تفصیلی طور پر نہیں دے دیئے گئے۔ ان کے صرف اصول اور حدود متعین کئے گئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآن مجید کو تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ تک کے لئے ضابطۂ حیات بننا تھا۔ اگر اس کے اصولوں پر عمل درآمد کے تمام طرق و جزئیات بھی اسی میں متعین کر دی جاتیں تو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ان پر من و عن عمل کرنا ممکن نہ رہتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے، اس راہ نمائی کے اصول و حدود متعین کر دیئے اور اسے اُمتِ مسلمہ پر چھوڑ دیا کہ وہ، اپنے اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق خود متعین کرے۔ ان طریقوں کے منشاء خداوندی کے مطابق ہونے کا معیار یہ ہوگا کہ وہ، ان اصول و حدود سے نہ ٹکرائیں جو قرآن مجید میں دیئے گئے ہیں۔

وحیٔ خداوندی نے یہی انداز نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی اختیار کیا۔ اس نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اصول خط و خال قرآن کریم میں محفوظ کر دیئے۔ اور اسے اُمت پر چھوڑ دیا کہ وہ اس کی جزئیات و تفاصیل مرتب اور محفوظ کرے۔ یہ جزئیات کتب روایات و تاریخ میں مذکور ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا، اس میں سقم یہ رہ گیا کہ یہ روایات حضورؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے مرتب اور جمع ہوئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں غلط اور صحیح ہر قسم کی روایات نے راہ پا لیا۔ انہی مجموعوں سے حضورؐ کی سیرت بھی مرتب کی گئی اور بدقسمتی سے اس میں بھی ہر قسم کی روایات شامل ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ کے صحیح اور قابلِ اعتماد ہونے کا معیار یہ ہوگا کہ اس میں کوئی واقعہ ایسا نہ ہو جو قرآن کریم کے کسی اصول سے متخالف ہو، یا ان خطوط سے ٹکرائے جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ یہی وہ سیرتِ طیبہ ہوگی جسے سنتِ رسول اللہؐ کہا جائے گا، اور یہی وہ اسوۂ حسنہ ہوگا جس کا اتباع، منشاء خداوندی کی تعمیل قرار پائیگا۔

جو شخص اس سنت یا اسوۂ حسنہ کے اتباع سے انکار کرے، وہ خود قرآن کا منکر ہوگا۔ میں نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اسی اصول کے مطابق مرتب[1] کی ہے۔ یعنی میں نے، سرعنوان، قرآن کریم کی اس آیت کو رکھا ہے جس کا تعلق حضورؐ کی سیرت کے کسی گوشہ سے ہے اور اس کے تحت، کتب، احادیث، سیر اور تاریخ سے ان واقعات کو درج کیا ہے جو اس آیت کے مطابق ہیں۔ جو واقعات اس کے خلاف جاتے ہیں، انہیں میں نے مسترد کر دیا ہے کیونکہ وہ حضورؐ کے اعمال و ارشادات ہو نہیں سکتے۔ یہ ہے وہ سیرت کی کتاب، جس کے ابتدائیہ (صبح بہار) کا مقطع کا بند یہ ہے کہ:-

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم[2] کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ:-

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰؐ رو　　(اقبالؒ)

اس وقت اتنی گنجائش نہیں کہ میں حضورؐ کی عظمتِ سیرت کے متعلق مختلف دیدہ وروں کا اعتراف آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس وقت میں صرف ایک مؤرخ کے گلدستۂ عقیدت کا صرف آخری پھول آپ کے سامنے لانے پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس فرانسیسی مؤرخ کا نام ہے۔ (LAMARTINE.) وہ اپنی کتاب (HISTOIRE DE LA TURQUIE. 1854) میں بارگاہِ رسالت میں اپنے ہدیۂ عقیدت کے آخر میں کہتا ہے کہ:-

> ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت اور بلندی کو ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے، اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان کبھی کوئی ہوا ہے؟

یہ غیروں کی شہادت ہے، اللہ تعالیٰ کے اس اعلانِ عظیم کی تائید میں کہ:-

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۶۸/۴)

اے رسولؐ: یہ حقیقت ہے کہ تو مکارمِ اخلاقِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔

---

[1] معراجِ انسانیت جس کا تیسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔
[2] اس کے لئے میری کتاب معراجِ انسانیت دیکھئے۔

حضورؐ کے مکارمِ اخلاق کی اس بلندی اور سیرتِ مقدسہ کی پاکیزگی کی ابتداء دعوےٰ نبوت کے بعد نہیں ہوئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ جس بطلِ جلیل کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریوں کے لئے منتخب کیا جاتا تھا اس کی سیرت شروع ہی سے سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ ہوتی تھی۔ آپ نے جب دعویٰ نبوت کیا تو آپ کے اولین مخاطب (اور شدید مخالف) قریش نے

دعوےٰ نبوت کی صداقت کا ثبوت

پوچھا کہ آپ کے پاس اس دعویٰ کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ اس لئے کہ وحی کوئی ایسی محسوس شے نہیں تھی جسے دیکھ یا سُن کر وہ جان لیتے کہ یہ کوئی فی الواقعہ فوق الفطرت ذریعۂ علم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپؐ نے ان کے اس سوال کا جواب کیا دیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) میں یہاں کوئی اجنبی یا نووارد نہیں۔ میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے درمیان بسر کی ہے۔ تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ تم خود غور و فکر سے کام لو اور سوچو کہ اس قسم کی زندگی کسی جھوٹے انسان کی ہوتی ہے یا سچے کی؟ ——— اور اس جواب پر کسی ایک نے بھی تردید کا ایک لفظ تک نہ کہا۔

یہ تو رہی حضورؐ کی زمانہ قبل از نبوت کی کیفیت۔ دعویٰ نبوت کے بعد کے دور کے متعلق قرآن کریم میں متعدد بار یہ آیا ہے کہ وہ لوگ حضورؐ کی تکذیب کرتے تھے۔ اس سے حقیقت ناآشنا یا تعصب گزیدہ مخالفین یہ مراد لیتے ہیں کہ وہ آپ کو جھوٹا کہتے تھے۔ یہ صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ ان لوگوں سے کہتے تھے کہ اس وقت تم بے شک بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے ہو۔ تمہیں دولت، قوت، ثروت سب کچھ حاصل ہے۔ لیکن تمہارا نظامِ زندگی باطل ہے اور خدا کا قانون یہ ہے کہ باطل نظام آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے اس لئے تمہارا انجام بھی تباہی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ بربادی تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ اور ہر مقام پر ہوتا ہے، وہ لوگ قوت کے نشہ میں بدمست و مدہوش جواب دیتے کہ یہ غلط ہے۔ یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ہمارا انجام تباہی ہوگا یہ صحیح نہیں۔ ان کا یہ ردِّ عمل تھا جسے قرآن کریم نے تکذیب کہہ کر پکارا ہے۔ وہ اس قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے تھے۔ حضورؐ کو جھوٹا نہیں کہتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ: قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ ۖ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس سے تم ملول خاطر ہوتے ہو۔ لیکن اس میں تمہارے لئے حزن و ملال کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ: فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (۶/۳۳) یہ لوگ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے۔ یہ کہتے یہ ہیں کہ خدا کا قانون جھوٹا ہے۔ جیسا وہ قانون کہتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ——— اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے حضورؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حتیٰ کہ سات آٹھ برس تک آپ سے لڑائیاں تک بھی لڑتے رہے۔ لیکن آپ کے کیریکٹر کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک بھی نہ کہا۔ یہ ہے عظمتِ کردار کی سب سے محکم شہادت!

حضورؐ کی پاکیزگیٔ سیرت کے متعلق، اللہ تعالےٰ کی شہادت، اور خود حضورؐ کے معاصرین کا اعتراف

تو یہ تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ہماری بدقسمتی کہ جب آپ کی سیرت مرتب کرنے کا وقت آیا تو اس وقت دشمنانِ اسلام کی گہری سازش کارفرما ہو چکی تھی۔ اس سازش کا طریق کار کیا تھا، اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ...... (6/113)
اور ہر نبی کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ دین کے دشمن اس کے خلاف سازشیں کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ بڑی خوش آئند اور ملمع ساز باتیں چپکے چپکے پھیلاتے رہتے تھے تاکہ لوگ ان سے دھوکا کھا جائیں۔

روایات سازی

اسلام اور اس کے داعی کے خلاف یہ سازش روایات سازی کی شکل میں اختیار کی گئی۔ جیسا کہ معلوم ہے، روایات (یعنی احادیث) نہ تو رسول اللہ ص کے زمانہ مبارک میں مرتب ہوئیں اور نہ خلافتِ راشدہ کے دور میں۔ انہیں حضورؐ کی وفات کے قریب دو اڑھائی سو سال بعد جمع اور مرتب کیا گیا۔ اور وہ بھی لوگوں کی زبانی، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے۔ اس وقت وضعی روایات کس کثرت سے پھیل چکی تھیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ احادیث کے سب سے بڑے جامع، امام بخاریؒ کے بیان کے مطابق، انہیں قریب چھ لاکھ احادیث ملیں، جن میں سے انہیں قریب تین ہزار (یعنی مکررات نکال کر ۲۷۶۲) احادیث صحیح معلوم ہوئیں اور باقی پانچ لاکھ ستانوے ہزار وضعی اور ضعیف نکلیں۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ احادیث کے مرتب اور جمع کرنے کے وقت وضعی احادیث کس کثرت سے پھیل چکی تھیں۔
ان جامعین روایات نے کتنی ہی دیدہ ریزی سے کام لیا ہو، لیکن تھے تو وہ بھی بالآخر انسان ہی جس سے سہو و خطا کا ہمیشہ امکان ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے مرتب کردہ مجموعوں میں بھی ایسی روایات باقی رہ گئیں یا بعد میں راہ پا گئیں، جو وضعی اور ساقط الاعتبار تھیں۔ یہ تھا وہ مسالہ (MATERIAL) جس سے نبی اکرم ص کی سیرتِ طیبہ اور ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ مدوّن ہوئی۔ روایات کی چھان بین میں اگر معیار وہ رکھا جاتا جسے میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی سند قرآن کریم کی ہوتی۔ جو روایت قرآنی معیار کے مطابق ہوتی، رسول اللہ ص کی طرف اس کی نسبت صحیح تسلیم کر لی جاتی۔ جو اس کے خلاف جاتی اسے مسترد کر دیا جاتا، تو روایات کے مجموعوں میں بھی رطب و یابس بار نہ پاتا، اور حضورؐ کی سیرتِ طیبہ بھی نہایت شفاف صورت میں وجہِ تابانی عالم بن جاتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور ہماری کتب روایات (یعنی وہ کتابیں جنہیں صحیح ترین کہہ کر پکارا جاتا ہے) ان میں بھی، ایسی ایسی روایات شامل ہو گئیں جن سے حضور ص کی سیرتِ مقدسہ داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔
حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے خلاف معاندینِ اسلام جس قدر اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں وہ انہی روایات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان معترضین کو ہدفِ سبّ و شتم بناتے رہتے ہیں لیکن ان کتبِ روایات کو سر آنکھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں جو ان اعتراضات کا سرچشمہ ہیں، اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ جو شخص یہ کہہ دے کہ اس قسم کی روایات صحیح نہیں ہو سکتیں اسے

منکرِ حدیث قرار دے کر ملحد و بے دین ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ میرا انکارِ حدیث اسی نوعیت کا ہے۔

ہماری تاریخ کے پہلے دور میں جو کتبِ سیرت مرتب ہوئیں یا غیر مسلم معاندین نے جو اعتراضات کئے، مرورِ زمانہ سے ان کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی اور توقع کی جاتی تھی کہ اب اسلام اپنی اصل صورت اور حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اپنے حقیقی خط و خال کے ساتھ دنیا کے سامنے آ سکیں گے۔ پاکستان کا

پاکستان میں سازش

خطۂ زمین اسی عظیم مقصد کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن اسے ہماری سوختہ بختی کہئے کہ یہاں بھی اسی قسم کی سازش کارفرما ہو گئی جس قسم کی سازشوں نے اس سے پہلے اسلام کے تابندہ چہرے کو مسخ اور حضورؐ کی سیرتِ تابدار کو (معاذ اللہ) داغدار کیا تھا۔ اس سازش کے بانی ہیں ابوالاعلیٰ مودودی صاحب! انہوں نے پہلے، بہ حیثیت مجموعی اسلام کو اس رنگ میں پیش کیا جس سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نئی نسل اسلام ہی سے برگشتہ ہو گئی۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کی ایسی مضحکہ خیز تفسیر شائع کی جس پر علم روئے اور عقل ماتم کرے۔ تفسیر مکمل کرنے کے بعد، انہوں نے قرآن کریم کے متعلق ایک ایسا شگوفہ چھوڑا جس سے قرآن پر ایمان ہی جاتا رہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید سات زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسول اللہؐ نے بھی قرآن کو ان سات زبانوں میں پیش کیا اور امت کو سکھایا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے صرف ایک زبان کے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا، حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا کوئی حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا، اور نہ ہی رسول اللہؐ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا۔ (ترجمان القرآن بابت نومبر و دسمبر ۱۹۷۵ء) اس کے ساتھ ہی انہوں نے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی سیرت کو ایسے گھناؤنے انداز میں پیش کیا جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ (دیکھئے ان کی کتاب خلافت و ملوکیت) یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد انہوں نے اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں، اپنے ترکشِ بغض و عناد کا آخری تیر نکالا اور اس کا ہدف (معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ) خود ذاتِ رسالتمآب (علیہ التحیۃ والسلام) کو بنانے کا مذموم ارادہ کیا۔ یعنی کہا کہ وہ اب حضورؐ کی سیرت مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ اس خبر سے ہمارے کاشانۂ قلب پر ہزاروں بجلیاں گر گئیں۔ اس لئے کہ ذاتِ رسالتمآبؐ کا وہ مقام ہے جس کے متعلق کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ:-

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

ہم نے پوری دلسوزی اور جانگدازی سے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اسلام کو بدنام کرنے میں بہت کچھ کر چکے ہیں۔ اب خدا کے لئے رک جائیے اور حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ کے خلاف دست درازی کی جرأت نہ کیجئے کہ یہ مقام انتہائی نازک ہے۔ (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام۔ بابت جولائی ۱۹۷۲ء) لیکن

مودودی صاحب

وہ جس سازش کو اپنی زندگی کا منتہیٰ بنائے بیٹھے ہیں، وہ انہیں اس قسم کی اپیلوں پر کب کان دھرنے دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے ماہنامہ میں اس موضوع پر مسلسل لکھنا شروع کر دیا ہے۔ میں ان کی تحریروں کے چند ایک اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کرنے

کی اجازت چاہوں گا۔ ان سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ وہ کس قسم کی سیرت، دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں میں ایک اور نکتہ بھی تمہیداً پیش خدمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب غیر مسلم معاندین حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف کچھ لکھتے ہیں تو ہم یہ کہہ کر اس کی مدافعت کی کوشش کرتے ہیں کہ جن روایات کی بنا پر تم ایسا کہتے ہو، وہ وضعی اور ضعیف ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کے متعلق اس قسم کی مدافعت یا معذرت بھی پیش نہیں کی جا سکے گی۔ ایک تو اس لئے کہ انہوں نے بے پناہ روپیہ کے زور پر اپنے متعلق ایسا عالمگیر پروپیگنڈہ کر رکھا ہے جس کی رو سے تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ یہ عصرِ جدید کے جید عالمِ دین اور مفسرِ اعظم ہیں جنہیں مغربی اور مشرقی علوم پر کامل عبور حاصل ہے۔ یہ "امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابنِ تیمیہؒ کے ہم پایہ اور اللہ کے شاہکار" ہیں۔ پھر ان کی تصنیفات و تالیفات کے تراجم مغربی زبانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معتقدینِ حدیث، اپنے عقیدہ کی رو سے اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ احادیث کے ان مجموعوں میں جنہیں صحیح قرار دیا گیا ہے جو روایات بھی درج ہیں انہیں صحیح تسلیم کریں اور "تنقید سے بالا قرار دیں۔ حتیٰ کہ (جماعت اہلِ حدیث کے سابق صدر، مولانا اسماعیل مرحوم کے ارشاد کے مطابق) ان میں سے کسی حدیث کا انکار بھی کفر اور ملت سے خروج کے مرادف قرار پائے گا۔ لیکن مودودی صاحب کا یہ مسلک نہیں۔ وہ، ان مجموعوں میں درج کسی حدیث کو بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتے اور صرف اسی حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جو ان کے اپنے معیار پر پوری اُترے[1]۔ اس سے ظاہر ہے کہ سیرتِ رسول اللہؐ کے متعلق جو کچھ مودودی صاحب دنیا کے سامنے پیش کریں گے وہ، عہدِ حاضر کے ایک ماڈرن عالم اور مفسر کے معیار کے مطابق، صحیح ترین روایات پر مبنی، لہٰذا انتہائی قابلِ اعتماد تسلیم کیا جائے گا۔ اب آپ اس سیرتِ طیبہ کی دو چار مثالیں ملاحظہ فرمائیے جسے مودودی صاحب آجکل مرتب فرما رہے ہیں۔

عالمِ انسانیت میں، نبوت یا وحی ایک ممتاز، استثنائی طریقِ مشیّت تھا۔ وحی، خدا کی طرف سے ایک منفرد برگزیدہ فرد کو اس طرح عطا ہوتا تھا کہ اس میں اس کے ذاتی کسب و ہنر، محنت و ریاضت یا فکر و تدبر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ نزولِ وحی سے قبل پہلے تک اسے اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس منصب کے لئے منتخب کیا جانے والا ہے۔ اس کے برعکس جوگیوں، سنیاسیوں، راہبوں، عیسائیوں کے ولیوں وغیرہ کا طریق یہ تھا۔ (اور اب تک یہی طریق ہے جس میں ہمارے صوفیاء اور اولیاء بھی شامل ہیں) کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں، غاروں یا خانقاہوں اور حجروں کی خلوت گاہوں میں، ریاضتوں، مراقبوں اور چلہ کشیوں سے بزعمِ خویش خدا سے تعلق پیدا کرتے تھے۔ یہودی اور عیسائی،

---

[1] یہ ساری بحث اس مقالہ میں دیکھئے جو "مودودی صاحب کے نظریۂ حدیث" کے عنوان سے طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

رسول اللہ کو نبی تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن وہ آپؐ کے مشن کی بے مثال کامیابی کے بعد، آپ کے مقام کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس کے لئے سوچا یہ کہ حضورؐ کو انبیاء کے زمرہ سے نکال کر، راہبوں اور ولیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر دی گئیں کہ حضورؐ دعوائے نبوت سے قبل راہبوں کی طرح غاروں میں جا کر چلہ کشی کیا کرتے تھے۔ اس سے آپؐ پر کچھ مکاشفات ہونے لگے تو آپؐ نے اپنے آپ کو نبی سمجھ لیا اور نبوت کا دعوے کر دیا۔[1]

غارِ حرا

اس میں شبہ نہیں کہ حضورؐ منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے، اپنے قلبِ سلیم کی روشنی میں، اپنے معاشرہ کے باطل حاضرہ موجودہ سے متنفر اور کنارہ کش رہتے تھے۔ آپؐ کو، آپؐ کا فکر و تدبر اس نتیجہ پر تو پہنچا دیتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہے، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ جو کچھ ہونا چاہیئے وہ کیا ہے۔ یہ حقیقت صرف وحی کی رو سے منکشف ہو سکتی تھی۔ اور وحی ہنوز آپؐ کے سامنے تھی نہیں۔ قرآنِ کریم اس پر شاہد ہے کہ اس جذبہ کے ماتحت آپ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے۔ —— وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷) سے اسی تجسس کا اظہار مقصود ہے۔ لیکن حضورؐ، اس تلاشِ حقیقت میں تفکر و تدبر اور غور و خوض سے کام لیا کرتے تھے۔ جوگیوں اور راہبوں کی طرح غاروں میں جا کر تپسیا اور مراقبے نہیں کیا کرتے تھے۔ حضورؐ تو ایک طرف، تاریخ میں اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ قریش میں اس قسم کا طریق رہبانیت مروّج تھا اور ان میں سے کوئی بھی کبھی غاروں میں جا کر خلوت گزیں ہوا تھا —— اس سے واضح ہے کہ اس قسم کی روایات عیسائیوں کی تراشیدہ تھیں۔ لیکن مودودی صاحب، اپنی کتاب سیرت کی ابتداء ہی اسی سے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

> پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے۔ یہ کس طرح کی عبادت تھی جو آپؐ کرتے تھے، کیونکہ اس وقت تک اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا۔ آپؐ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے۔ پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور وہ مزید چند روز کے لئے سامان آپؐ کے لئے مہیا کر دیتیں ...... ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ آپ ہر سال ایک مہینہ حرا میں گزارتے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ دسمبر سنہ۱۹۷۳ء۔ صلا)

---

[1] یہ عجیب کہ خود ہمارے ہاں کے صوفیا نے، اپنے مراقبوں اور چلہ کشیوں کے جواز میں ان روایات کو تقویت پہنچائی ہے۔ وہ اپنی ان ریاضتوں کے لئے انہی روایات کا سہارا لیتے اور اسے طریقِ نبوی قرار دیتے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں خود کسی زمانے میں اس سے متفق تھا لیکن للہ الحمد کہ بعد میں غور و فکر کے بعد اس کے وضعی ہونے کی حقیقت مجھ پر واشگاف ہو گئی۔

اب آگے بڑھئے اور یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب آغازِ نبوت کا قصہ کیا بیان فرماتے ہیں، کہتے ہیں:

جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہو گئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپ پر غارِ حرا میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔ بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہ رضؓ سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ، میں نے کہا: "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا۔ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہ رضؓ کے پاس پہنچ کر کہا۔ "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ"۔ چنانچہ آپ کو اڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے فرمایا۔ "اے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے"۔ پھر سارا قصہ آپ نے ان کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ انہوں نے کہا۔ "ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم، آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں)، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں"۔

پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے، زمانہ جاہلیت میں بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے ان سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیئے۔ (ابونعیم کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود سارا قصہ وَرَقہ کو سنایا) وَرَقہ نے حضورؐ سے کہا۔ بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ وَرَقہ نے کہا۔ "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی"۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وَرَقہ نے کہا، ہاں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ

لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وَرَقَہ کا انتقال ہو گیا۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۷۶ء - ص ۱۲-۱۳)

پہلی وحی کا ماجرا

قبل اس کے کہ میں یہ عرض کروں کہ یہ قصہ کتنی بڑی اور گہری سازش کا وضع کردہ ہے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر چند نبی کو قبل از نبوت اس کا ادراک و احساس تک نہیں ہوتا کہ اسے منصبِ نبوت پر سرفراز کیا جائے گا، لیکن اس کی حالت — (معاذ اللہ) اس حکایت کی سی نہیں ہوتی جس میں کہا گیا ہے کہ ایک بادشاہ بلا ولی عہد چھوڑے مر گیا تو امراء سلطنت نے فیصلہ کیا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے دارالسلطنت کے دروازے میں داخل ہو اس کے سر پر تاج رکھ دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح ایک کمہار کو بادشاہ بنا دیا گیا — جس بطلِ یگانۂ روزگار کو نبوت کی ذمہ داریاں سونپنی مقصود ہوتی تھیں، اسے دایۂ مشیتِ خداوندی شروع سے اس مقصد کے لئے تیار کرتی تھی اور نبوت سے پہلے وہ نبوت کے سوا جوہرِ انسانیت سے آراستہ اور بلند ترین صلاحیتوں سے پیراستہ ہوتا تھا۔ اس حقیقت کو خود ذاتِ باری تعالیٰ نے تذکرۂ حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو منصبِ نبوت سے نوازا گیا تو ازرو سپاس گذاری آپ کی جبینِ نیاز بدرگاہِ رب العزت جھک گئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ اے موسیٰؑ! تم نے اسے ہمارا احسان سمجھا اس لئے جذباتِ تشکر تمہارے آبگینۂ قلب سے چھلک پڑے۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ ان احسانات کا سلسلہ کب سے شروع ہے؟ اس کے لئے تمہیں بہت پیچھے جانا ہوگا۔ یہ سلسلہ تو تمہارے یومِ پیدائش سے شروع ہو گیا تھا جب ہم نے تمہاری والدہ کو کہلا بھیجا تھا کہ تمہیں ایک صندوق میں لٹا کر دریا میں بہا دے۔ تم اس صندوق میں بند، فرعون کے محلات میں جا پہنچے۔ تم نے بڑے ہو کر (نبی کی حیثیت سے) فرعون سے ٹکر لینی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم امورِ سلطنت اور اسرارِ حکومت سے واقف ہوتے۔ لیکن تم تو محکوم قوم کے فرد تھے اس لئے تمہارے لئے ان اسرار و رموز تک بار پانا ممکن نہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ تدبیر کی کہ تمہاری پرورش خود محلاتِ شاہی میں ہو۔ لیکن تم نے شاہزادگی اور شہنشاہی کی زندگی تو بسر نہیں کرنی تھی۔ تم نے ایک دن بنی اسرائیل کو لے کر سینا کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی جانا تھا اور وہاں ان کی تربیت کرنی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم صحرائی اور بیابانی شب و روز سے بھی واقف ہو جاؤ۔ اس ضمن میں ایسی تدبیر کی گئی کہ تم شاہی محلات چھوڑ کر مدین کی چراگاہوں میں ریوڑ چراؤ۔ اس طرح جب فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔ ہم نے تمہیں مختلف بھٹیوں میں سے گذار کر کندن بنا دیا۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى تو تم ہمارے پیمانے پر پورے اُترے۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۚ (۲۰/۴۰-۴۱) اور ہم نے تمہیں

؎۱ تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ - مقامِ محمدیؐ - شائع شدہ "سلیم کے نام خطوط - جلد دوم"۔

اپنے پیشِ نظر پروگرام کے لئے منتخب کیا۔ یہ نہیں کہ تم آگ لینے کو آئے اور پیغمبری مل گئی ـــــ پیغمبری اس طرح نہیں ملا کرتی۔

ایسی ہوتی تھی ایک ہونے والے نبی کی شخصیت، نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے۔ اس کی روشنی میں آپ اس واقعہ پر غور فرمائیے جسے مودودی صاحب نے اس تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہی خلافِ قرآن ہے کہ فرشتہ لکھی ہوئی وحی حضورؐ کے سامنے لے کر آیا اور حضورؐ سے کہا کہ اسے پڑھو۔ وحی تحریری شکل میں پیش نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے متعلق قرآن میں ہے کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) اسے قلبِ نبوی میں ڈالا جاتا تھا۔

اس کے بعد حضورؐ کے خوف و ہراس کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے، اسے پڑھ کر تو کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ ..... نزولِ وحی کا واقعہ غیر متوقع ہی سہی لیکن کائنات کی جس عظیم ترین شخصیت کو اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا کیا اس قسم کے واقعہ پر اس کی حالت ایسی ..... ہونی چاہیئے تھی؟ صاف نظر آتا ہے کہ معاندینِ اسلام نے یہ کہنے کے لئے کہ یہ تھی ـــ (معاذ اللہ) تمہارے رسولؐ کے قلب و دماغ اور دل گردے کی کیفیت، اس افسانہ کو وضع کر دیا۔ منصبِ نبوت کی ذمہ داریوں اور راستے کی مشکلات کے احساس سے مشوش و متفکر ہونا اور بات ہے۔ یہ وہ بارِگراں تھا جس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے کہا کہ: وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ (۹۴/۲-۳) ذمہ داریوں کے جس بارِگراں نے تیری کمر خمیدہ کر دی تھی، ہم نے آخرالامر انہیں اٹھا دیا۔ یعنی تم ذمہ داریوں کو پورا کر کے ان کے بارِگراں سے سبکدوش ہو گئے۔ ان ذمہ داریوں کے بارِگراں کے احساس کی اور بات تھی اور وہ کیفیت بالکل الگ جس کا نقشہ مذکورہ صدر قصہ میں کھینچا گیا ہے۔ وہ ایک نبی کے قطعاً شایانِ شان قرار نہیں پا سکتا۔ لہٰذا وضعی ہے۔

پھر حیرت اندر حیرت یہ کہ حضورؐ کے خوف کا تو یہ عالم کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ لیکن ایک عورت (اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) آپؐ کو یہ کہہ کر تسلیاں دے رہی ہے کہ گھبرائیے نہیں۔ خوف مت کھائیے۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ آپ کو تکلیف میں مبتلا نہیں کرے گا۔ وہ آپؐ کو رسوا نہیں کرے گا۔ معترضین پوچھتے ہیں کہ کیا آپؐ کو اللہ تعالیٰ پر ایسا بھروسہ نہیں تھا جو آپؐ کی بیوی کو اس کا اطمینان دلانا پڑا؟

اور اس سازش کا نقطۂ ماسکہ آگے چل کر آتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچازاد بھائی کے پاس لے گئیں جو عیسائی عالم تھا۔ اس نے یہ ماجرا سنا تو آپؐ سے کہا کہ یہ تو وہی وحی لانے والا فرشتہ تھا جو انبیاء سابقہ کی طرف آیا کرتا تھا۔ آپ خوش ہو جیئے کہ آپؐ نبی ہونے والے ہیں۔ اس سے آپ کا اطمینان ہو گیا۔

یہ تراشیدہ قصہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ عیسائیوں نے اسے یہ ثابت کرنے کے لئے وضع کیا تھا کہ

تمہارا رسولؐ اتنا بھی نہیں جانتا تھا جتنا ہمارا ایک عالم جانتا تھا   اور اس کے بعد وہ اس کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل نے (معاذاللہ) حضورؐ کو بھکانے کے لئے کہہ دیا تھا کہ وہ وحی لانے والا فرشتہ تھا۔ ورنہ اگر اسے اس کا یقین ہوتا کہ آپ پر وحی نازل ہوئی ہے تو وہ سب سے پہلے حضورؐ کی نبوت پر خود ایمان لے آتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور وہ عیسائی کا عیسائی مرگیا۔—— لیکن (معترضین کہتے ہیں کہ) وہ اپنی تدبیر میں کامیاب رہا۔ اس کے کہنے پر آپؐ کو یقین ہوگیا کہ آپؐ واقعی نبی بنا دیئے گئے ہیں۔

اس قسم کے قصّوں سے، عزیزانِ من! اس سیرتِ طیبہ کا آغاز ہوتا ہے جسے مودودی صاحب، اپنی زندگی کے (غالباً) آخری کارنامے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں! یاد رکھئے:

> اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو اپنی نبوت کے لئے چن لیتا ہے تو اس کے دل کو شکوک و شبہات اور وساوس سے پاک کرکے یقین و اذعان سے بھر دیتا ہے۔ اس حالت میں اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور اس کے کان جو کچھ سنتے ہیں اس کی صحت کے متعلق کوئی ادنیٰ سا تردد بھی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پورے شرح صدر کے ساتھ ہر اس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر منکشف کی جاتی ہے خواہ وہ کسی مشاہدے کی شکل میں ہو جو اسے آنکھوں سے دکھایا جائے یا الہامی علم کی شکل میں ہو جو اس کے دل میں ڈالا جائے ...... تمام خداداد احساسات کی طرح پیغمبر کا یہ شعور و احساس بھی ایک ایسی یقینی چیز ہے جس میں غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں (ہوتا) —— ان تمام صورتوں میں پیغمبر کو اس امر کا پورا شعور ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے قطعی محفوظ و مامون ہے۔ (ترجمان القرآن - جنوری ۱۹۷۷ء)

آپ نے غور فرمایا کہ جس برگزیدہ ہستی کو خدا منصبِ نبوت کے لئے چن لیتا تھا اس کے یقین و اذعان کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ کیا اس کے بعد اس بات کو ایک لمحہ کے لئے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ پیغامِ نبوت ملنے پر حضورؐ کی حالت وہ ہوگئی ہوگی جس کا ذکر مودودی صاحب نے فرمایا ہے۔

لیکن ٹھہریئے، اور حیرت و تعجب کے کانوں سے یہ بھی سنیئے کہ یہ اقتباس جسے میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے خود مودودی صاحب کا ہے اور لکھا گیا ہے سلسلۂ سیرت ہی کے ضمن میں! اس سے یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرے گا کہ مودودی صاحب اس قسم کی متضاد باتیں کیوں اور کیسے کہہ جاتے ہیں؟ لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ان کی ساری ٹیکنیک یہی ہے۔ ان کا مقصد سستی شہرت حاصل کرنا ہے۔ وہ عوام کے لئے داستان گو واعظوں کے افسانے بھی اپنے خریطہ میں رکھتے ہیں اور ارباب فہم و شعور کیلئے ان کی تردید کا سامان بھی ؎

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است   با ما شراب خوردہ، و، بہ زاہد نماز کردہ

پیغمبر کے اس قدر غیر متزلزل یقین اور جنت بداماں اطمینان کے اعتراف کے بعد مودودی صاحب کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے کہ :-

خودکشی کا ارادہ

پہلی وحی نازل ہونے کے بعد ایک مدت تک جبرائیل علیہ السلام کوئی وحی نہ لائے اور اس پر آپ کا رنج و غم اتنا بڑھتا چلا گیا جتنی یہ مدت طویل ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آپ بے خودی کے عالم میں کبھی ثبیر و مکہ کے ایک پہاڑ اور کبھی غارِ حرا پر جا کر ارادہ فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ اس حالت میں جبکہ آپ کسی پہاڑ کے کنارے کا رخ کر رہے تھے آپ نے آسمان سے ایک آواز سنی اور آپ ٹھہر گئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جبرائیلؑ آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آئے اور انہوں نے کہا کہ — اے محمدؐ! آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرائیل ہوں ..... (حضورؐ نے فرمایا کہ) میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا کہ مجھے اڑھاؤ۔ مجھے اڑھاؤ — چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اڑھا دیا۔ (ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۷۴ء)

یہ ایک نبی (اور نبی بھی آخر الزمان علیہ التحیۃ والسلام) کی سیرت بیان ہو رہی ہے! یا للعجب!! آپ (معاذ اللہ) بیخودی کے عالم میں اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے — وہ خودکشی جسے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے — اور اس کے بعد پھر وہی خوف اور پھر وہی دہشت!

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

حضرت اسرافیل

نبوت کے بعد ابتدائی تین سال تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت اسرافیل کو تعلیم کے لئے لگا دیا گیا تھا۔ وہ وحی نہیں لاتے تھے کیونکہ وحی لانا صرف جبرائیل علیہ السلام کا کام تھا۔ البتہ وہ کسی اور طریق سے حضورؐ کو علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ (ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۷۴ء)

قرآن کریم میں نہ وحی کے علاوہ کوئی اور طریقِ ابلاغِ نبوت بتایا گیا ہے اور نہ ہی اس میں اسرافیل کا لفظ تک بھی آیا ہے۔ اس بیان کی کمزوری کو محسوس کر کے مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ناقدینِ حدیث نے اس کی صحت سے قطعی انکار کر دیا ہے

لیکن آخر میں انہوں نے اپنا خیال یہی ظاہر کیا ہے کہ "کیا عجب کہ اس خزانۂ (علوم) کو آپ کے سینے میں بھر دینے کی خدمت اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل سے لی ہو" (ایضاً)

وحی کا نزول تین سال تک بند رہا اور علوم کی تعلیم حضرت اسرافیل اور طریق سے دیتے رہے! سبحان اللہ۔

معراجِ نبویؐ

احوال و کوائفِ سیرت کے ضمن میں، مودودی صاحب نے معراجِ نبویؐ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور یہ تفصیلات وہی ہیں جنہیں آپ ہر سال شبِ معراج کی محفلوں میں واعظوں کی زبانی سنتے چلے آ رہے ہیں — اس واقعہ کی اہمیت کے

متعلق آپ لکھتے ہیں کہ:۔

یہ واقعہ درحقیقت تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانے کی رفتار کو بدل ڈالا ہے اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے۔[1]

(ترجمان القرآن ۔ نومبر ۱۹۷۶ء)

اگرچہ میں محسوس کرتا ہوں کہ قلتِ وقت کی بنا پر میرے لئے یہ مشکل تھا کہ میں ان تمام تفاصیل کو پیش خدمتِ سامعین کر سکوں جنہیں مودودی صاحب نے بیان فرمایا ہے لیکن اس واقعہ کی جو اہمیت مودودی صاحب نے بیان کی ہے اس کے پیشِ نظر ان تفصیلات کا پیش کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ لہٰذا آپ انہیں ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے ترجمان القرآن بابت نومبر ۱۹۷۶ء میں لکھا ہے:۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے تقریباً ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرمِ کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ اور نیم بیداری کی حالت میں اٹھا کر آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اُسے علم اور بُردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔

سینے کو چاک کر کے اسے پانی سے دھونے اور پھر اس میں علم و ایقان کے بھر دینے کا تصور ذہن میں لایئے اور اس کے ساتھ یہ بھی سوچیئے کہ زمانہ نبوت کے بارہ تیرہ برس تک تو حضورؐ کا سینہ علم اور ایمان و یقین کے جوہروں سے (معاذ اللہ) خالی رہا اور اس کے بعد اسے ان جوہروں سے بھرا گیا۔ (استغفر اللہ)۔ اب آگے بڑھیئے۔ فرماتے ہیں:۔

اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد گدھے سے بڑا اور خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا، اس کا ہر قدم حدِ نگاہ پر پڑتا تھا، اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔[2] جب آپؐ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریلؑ نے تھپکی دے کر کہا، دیکھ کیا کرتا ہے، آج تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ اس پر وہ شرمندہ ہو کر پسینے پسینے ہو گیا۔ پھر آپؐ اس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اُتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبریلؑ نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری

---

[1] میری قرآنی بصیرت کی رو سے معراج کا کیا مفہوم و مقصود ہے، اسے میں نے اپنے مقالہ "مقامِ محمدی" میں بیان کیا ہے جو "سلیم کے نام خطوط۔ جلد دوم" میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] قرآن کریم میں تو کسی نبی کے تذکرہ میں ایسا نہیں کہا گیا۔

منزل طورِ سینا کی تھی جہاں اللہ تعالٰے حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا تھا۔ تیسری منزل بیت اللحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل پر بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا اِدھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ کی۔ جبریلؑ نے کہا یہ یہودیت کی طرف بُلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی اِدھر آؤ۔ آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت ہی بنی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریلؑ نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریلؑ نے کہا دنیا کی باقی ماندہ عمر کا اندازہ اس عورت کی باقی ماندہ عمر سے کر لیجئے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر آپ اُسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریلؑ نے کہا، یہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچ کر آپ براق سے اُتر گئے اور اُسی مقام پر اُسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکلِ سلیمانی میں (جو اس زمانے میں منہدم تھا مگر اس کی جگہ موجود تھی اور قیصرِ جسٹینین نے وہاں ایک گرجا بنا رکھا تھا) داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریلؑ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں پانی۔ دوسرے میں دودھ۔ تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبریلؑ نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔ (ایضاً۔ ص ۱۱-۱۲)

بیت المقدس کو ہمارے ہاں مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ یہاں مودودی صاحب نے کہا ہے کہ اس زمانے میں یہودیوں کا یہ معبد وہاں موجود نہیں تھا۔ منہدم ہو چکا تھا۔ لیکن ان سے ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ مسجدِ اقصیٰ کو قبلۂ اوّل کیوں کہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ:۔

یہ قبلۂ اوّل اس لئے ہے کہ حضورؐ اور آپ کے ساتھی پہلے اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب تحویلِ قبلہ کا حکم آ گیا تو اس کی وہ اہمیت نہ رہی۔ لیکن قبلۂ اوّل ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے یہ عبادت گاہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقدس و محترم قرار پائی ......
...... جب تک مکہ معظمہ میں حضورؐ کا قیام رہا آپ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ اور خانہ کعبہ ایک رخ میں آ جاتے تھے۔ لیکن مدینہ میں یہ التزام ممکن نہ رہا —— کیونکہ اب ان عبادت گاہوں کے رخ مختلف سمتوں میں پڑتے تھے ...... (تحویل قبلہ سے پہلے) حضورؐ اور آپ کے ساتھی ایک طویل عرصہ تک مسجدِ اقصیٰ کی طرف، رُخ

کرکے نماز پڑھتے رہے ہیں۔[1] (الشیاء - ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء)

سوال یہ ہے کہ جب واقعۂ معراج کے وقت (۱۲ نبوی یا ۱۳ نبوی میں) بیت المقدس میں یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ موجود ہی نہیں تھی، تو وہ "مسجدِ اقصیٰ" کہاں تھی جس کی طرف حضورؐ رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور واقعۂ معراج کے ضمن میں جس کا ذکر کیا جاتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ بیت المقدس میں اموی خلیفہ، عبدالملک بن مروان نے ۷۲ھ ہجری میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جسے مسجدِ اقصیٰ کہتے ہیں۔[2] سورۂ بنی اسرائیل میں جس "مسجدِ اقصیٰ" کا ذکر ہے اس سے مراد مدینہ منورہ ہے جس کی طرف حضورؐ نے ہجرت فرمائی تھی اور جس کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔ فرماتے ہیں:-

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریلؑ اس کے ذریعے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کہ کون آتا ہے؟ جبریلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبریلؑ نے کہا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم)۔ پوچھا کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں۔ تب دروازہ کھلا اور آپ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی اُن بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلے پر مقیم تھیں۔ اُن میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی ساخت کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مُہرے اور جسم کی بناوٹ میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریلؑ نے بتایا یہ آدمؑ ہیں، آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت سے لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے، بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا یہ نسلِ آدم ہے۔ آدمؑ اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپ کو تفصیلی مشاہدے کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں مگر جتنی کاٹتے جاتے ہیں وہ اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔

---

[1] تحویلِ قبلہ کا واقعہ بھی صحیح نہیں۔ دیکھئے معراجِ انسانیت۔ عنوان قبلہ۔

[2] شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۲۰۵۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک آدمی کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ وہ اٹھا نہ سکتا تھا، مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دیکھی۔ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس میں سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا، مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے۔ پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے تھے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گزرتے ہیں، مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوئے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیئے جو ان کے نہ تھے۔

انہیں مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترش روئی سے ملا۔ آپ نے جبریلؑ سے پوچھا، اب تک جتنے فرشتے ملے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے۔ ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سُن کر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہوگئی۔

اس مرحلہ سے گزر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ حضرات یحییٰؑ اور عیسےٰؑ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک ایسے بزرگ سے کرایا گیا جن کا حُسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

پھر مزید ارتقاء شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر تمام خلائق کا علم ختم ہو جاتا ہے، اس کے ماوراء جو کچھ ہے وہ غیب ہے جس کا علم نہ کسی نبی کو ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو، سوائے اس کے جسے اللہ اس میں سے کوئی علم دے دے۔ نیچے سے جو کچھ جاتا ہے وہ یہاں لے لیا جاتا ہے، اور اوپر سے جو کچھ آتا ہے اسے یہاں وصول کر لیا جاتا ہے۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے ذہن میں اس کا تصور تک گزر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہِ جلال سامنے تھی۔ ہم کلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف

کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔
(ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۱۹-۱۵)

آسمانوں کے دروازوں کا بند ہونا اور حضرت جبریلؑ کے کہنے پر ان کا کھلنا اور ان میں ان انبیاء سابقہ سے ملاقات کرنا جنہوں نے ابھی ابھی آپ کی قیادت میں (بیت المقدس) میں نماز ادا فرمائی تھی، یہ سب امور غور طلب ہیں!

لیکن وہ سازش جس کے لئے اس قسم کی روایات کو وضع کیا گیا، اس کی حقیقی لِم اب سامنے آتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ عیسائیوں نے وَرقہ بن نوفل کا قصہ اس لئے وضع کیا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمانوں کے رسولؐ کو (معاذ اللہ) ایک عیسائی جتنا علم بھی حاصل نہیں تھا۔ اب یہودیوں کی باری آتی ہے۔ اسے غور سے سنیئے کہ مودودی صاحب کیا کہتے ہیں۔ تحریر ہے:۔

پیشیٔ خداوندی سے واپسی پر نیچے اُترے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے روداد سُن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں، میرا اندازہ ہے کہ آپ کی اُمت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جائیے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہٗ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ اُن کے کہنے پر آپ بار بار اُوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں۔ آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا، اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔ (کیونکہ ہر نیکی اللہ تعالےٰ کے ہاں دس نیکیوں کے برابر ہے۔) (ایضاً۔ صفحہ ۴۰-۱۹)

عزیزانِ من! سوچئے کہ یہودی سازش نے اپنے نبی (حضرت موسےٰؑ) کا کیا مقام، اور مسلمانوں کے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی کیا پوزیشن ظاہر کی ہے۔ رسول اللہؐ پچاس نمازوں کا حکم لے کر باطمینان.... تشریف لے آتے ہیں۔ لیکن جب حضرت موسیٰؑ یہ سنتے ہیں تو آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کی اُمت اتنی نمازوں کی پابند نہیں ہو سکے گی۔ جائیے، اور ان میں کمی کرائیے۔ آپ جاتے ہیں اور اللہ تعالےٰ دس کی (اور بعض روایات کی رو سے پانچ کی) کمی کر دیتے ہیں۔ آپ پھر مطمئن ہو کر آ جاتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ آپ کو پھر سمجھاتے ہیں۔ غرضیکہ کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے حتیٰ کہ ان نمازوں کی تعداد پانچ رہ جاتی ہے۔ آپ سوچئے، برادرانِ عزیز! کہ اس سے حضور اقدسؐ و اعظم کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔ اور پھر اُس خدا کا کس قسم کا تصور جو اتنی نمازیں فرض کر دیتا ہے جن کی پابندی ناممکن تھی، اور پھر بار بار اس میں کمی کر دیتا ہے! یہ ہے وہ سیرت جسے مودودی صاحب دنیا کے سامنے پیش فرما رہے ہیں!

واقعۂ معراج کے سلسلہ میں مودودی صاحب ان اعتراضات کا بھی جواب دیتے ہیں جنہیں وہ "منکرین حدیث" کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

سفرِ معراج کی جو تفصیلات حدیث میں آئی ہیں اُن پر منکرینِ حدیث کی طرف سے متعدد اعتراضات

کئے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے صرف دو ہی ایسے ہیں جو کچھ وزن رکھتے ہیں:۔

ایک یہ کہ اس سے اللہ تعالےٰ کا کسی خاص مقام پر مقیم ہونا لازم آتا ہے، ورنہ اس کے حضور بندے کی پیشی کے لئے کیا ضرورت تھی کہ اسے سفر کرا کے ایک مقامِ خاص تک لے جایا جاتا۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء ص ۱۹)

ہم پہلے اسی اعتراض کو لیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے متعلق فرمایا ہے کہ: هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔ (۵۷/۴) "تم جہاں کہیں بھی ہو، خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے"۔ بلکہ یہاں تک کہ: وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰/۱۶) "ہم انسان، کے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں"۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا کی یہ کیفیت ہو کہ وہ کائنات میں ہر جگہ موجود ہو اور ہر انسان سے اس قدر قریب، اس کے متعلق یہ کہنا کہ حضور اس سے ملنے کے لئے بہ جسدِ عنصری کسی خاص مقام میں تشریف لے گئے تھے قرآن کے بیان کردہ، خدا کے تصور کے خلاف ہے۔ خدا کو کسی مکان (SPACE) میں محدود سمجھنا، خواہ وہ ایک ثانیہ کے لئے کیوں نہ ہو، خدا کے ہر جگہ اور ہر وقت حاضر ناظر ہونے کے نقیض ہے۔ یاد رکھئے، وہی ایمان صحیح معنوں میں خدا پر ایمان کہلا سکتا ہے جو خدا کے اس تصوّر کے مطابق ہو جسے قرآنِ مجید نے بیان کیا ہے۔ ورنہ اپنے اپنے تصور کے مطابق تو کم و بیش تمام غیر مسلم بھی خدا کو مانتے ہیں۔ جس طرح واقعۂ معراج بیان کیا جاتا ہے اس کے خلاف یہ ہے اصولی اعتراض۔ یہ اعتراض "منکرینِ حدیث" کا وضع کردہ نہیں۔ (اگرچہ ہمیں معلوم نہیں کہ ان سے مودودی صاحب کی مراد کون لوگ ہوتے ہیں) یہ اعتراض ہر اس شخص کے دل میں ابھرتا ہے جو اس تصوّر کے مطابق ذاتِ باری تعالےٰ پر ایمان رکھتا ہے جسے قرآن مجید (یعنی خود خدا) نے عطا فرمایا ہے۔

اعتراض، آپ نے سُن لیا۔ اب اس کا جواب مودودی صاحب کے الفاظ میں سنیئے ــــ کہتے ہیں:۔

لیکن دراصل یہ دونوں اعتراض بھی قلتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ پہلا اعتراض اس لئے غلط ہے کہ خالق اپنی ذات میں تو بلاشبہ اِطلاقی شان رکھتا ہے مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنی کسی کمزوری کی بناء پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بناء پر محدود وسائط اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے جسے ایک انسان سُن اور سمجھ سکے۔ حالانکہ بجائے خود اللہ کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانی چاہتا ہے تو اسے لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتا ہے، کیونکہ بندہ ساری کائنات کو بیک وقت اُس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح خدا دیکھتا ہے۔ خدا کو کسی چیز کے مشاہدے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خالق کے حضور بار یابی کا بھی ہے کہ خالق بذاتِ خود کسی مقام پر متمکن نہیں ہے مگر بندہ اس کی ملاقات کے لئے ایک جگہ کا محتاج ہے

جہاں اس کے لئے تجلیات کو مرکوز کیا جائے۔ ورنہ اس کی شانِ اطلاق میں اس سے ملاقات بندۂ محدود کے لئے ممکن نہیں ہے۔ (ایضاً - ص۲)

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خوشامد پسند مصاحبین یا جاہل مریدوں کا حلقہ اس انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو کس طرح مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ مودودی صاحب فرماتے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ بذاتِ خود تو کسی مقام پر متمکن نہیں ہوتا لیکن چونکہ انسان اس سے اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ کسی خاص مقام میں محدود ہو جائے، اس لئے خدا انسانوں کی اس احتیاج کی وجہ سے اپنے آپ کو کسی خاص مقام میں محدود کر لیتا ہے! یہ کہتے ہوئے مودودی صاحب کو قطعاً خیال نہ آیا کہ اس دلیل کا سرچشمہ کونسا ہے اور اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے؟ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا خود حضرت مسیحؑ کے پیکر میں دنیا میں آیا، یا اس نے اپنے بیٹے کو جو خدا کی طرح شانِ الوہیت کا حامل تھا، انسانی شکل میں نہ صرف دنیا میں بھیجا بلکہ اُسے صلیب پر بھی چڑھوا دیا۔ جب ان پر اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کی ذات تو مطلق ہے لیکن چونکہ انسان اسے محسوس پیکر ہی میں دیکھ سکتا ہے اس لئے اس نے، انسانوں کی اس معذوری اور احتیاج کی بنا پر، انسانی پیکر اختیار کر لیا تھا۔

اور بعینہٖ یہی دلیل ہندوؤں اور مجوسیوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے جو اوتاروں کے قائل ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان چونکہ حقیقتِ مطلقہ کو لباسِ مجاز ہی میں دیکھ سکتا ہے اس لئے ان کی خاطر، خدا، محسوس اوتاروں کی شکل میں دنیا میں آ جاتا ہے ——— یہی دلیل مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں!

اور اپنی اس دلیل کی تائید میں جو مثال انہوں نے پیش کی ہے، وہ اس امر کی غماز ہے کہ یہ صاحب قرآنی حقائق و تصورات کی ابجد تک سے نابلد ہیں۔ فرماتے ہیں۔

مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے۔ جسے ایک انسان سن اور سمجھ سکے، حالانکہ بجائے خود اللہ کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ حضرات انبیاءؑ کرام سے کلام کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے قرآنِ کریم کو کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ کلام اسی انداز کا ہوتا تھا جس انداز سے ہم لوگ آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ یعنی ایک شخص (زبان سے) کچھ الفاظ بولتا ہے اور دوسرا شخص ان الفاظ کو کانوں سے سنتا ہے۔ مودودی صاحب کے نزدیک خدا اور نبی کے مابین کلام کا بھی یہی انداز ہوتا تھا۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) خدا اپنے اس کلام کے متعلق کہتا ہے کہ:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (۲۶/۱۹۳)

اے رسول! روح الامین (جبریل) اس کلام کو تیرے دل میں اتارتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو بات کسی کے دل میں ڈالی جائے وہ نہ تو زبان سے ادا کی جاتی ہے نہ کانوں سے سنی جاتی ہے۔ وحی کے متعلق ہم قطعاً نہیں جان سکتے کہ اس کے نزول کا انداز کیا تھا ——— کوئی غیر از نبی اسے

نہیں جان سکتا — لیکن قرآن کریم نے اتنا تو واضح کر دیا کہ وہ انسانوں کی سی آواز کی شکل میں نہیں آئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق بھی قرآن میں "کلام کرنے" کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ اس کا انداز بھی عام انسانی زبان اور کانوں کا سا نہیں تھا۔ اگر خدا کے کلام کرنے کا یہ انداز سمجھا جائے تو اس سے ایسی دشواریاں پیش آئیں گی جن کا حل ہی نہیں مل سکے گا۔ مثلاً خدا نے اپنے آپ کو "السمیع" کہا ہے — یعنی سننے والا — تو کیا اس سے بھی یہ مراد لی جائے گی کہ وہ (معاذ اللہ) ہماری طرح کانوں سے سنتا ہے؛ اور اس نے اپنے آپ کو "البصیر" بھی کہا ہے — یعنی دیکھنے والا — تو کیا وہ بھی ہماری طرح آنکھوں سے دیکھتا ہے — اور آگے بڑھیے۔ اس نے مویشیوں کے متعلق کہا ہے کہ: اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ...... (۳۶/۷۱)
ہم نے انہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے تو کیا اس سے مراد ہمارے جیسے ہاتھ ہوں گے؛

سچ جانیے! میں تو اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں کہ اسلام کو جس قدر نقصان یہ صاحب پہنچا رہے ہیں، خدا ہی جانے اس کے ازالہ کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی۔

اب آپ واقعۂ معراج کے سلسلہ میں دوسرے اعتراض کی طرف آئیے۔ کہتے ہیں:۔

> (واقعہ معراج کے خلاف دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو دوزخ اور جنت کا مشاہدہ اور بعض لوگوں کو عذاب ہونے کا معائنہ کیسے کرایا گیا جبکہ ابھی بندوں کے مقدمات کا فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ سزا اور جزا کا فیصلہ تو ہونا ہے قیامت کے بعد اور کچھ لوگوں کو سزا دے ڈالی گئی ابھی سے! (ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۹)

اس کی تردید میں فرماتے ہیں:۔

> یہ اعتراض اس لئے غلط ہے کہ معراج کے موقعہ پر بہت سے مشاہدات جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو کرائے گئے تھے ان میں سے بعض حقیقتوں کو ممثل کر کے دکھایا گیا تھا..... بُرے اعمال کی جو سزائیں آپ کو دکھائی گئیں وہ بھی تمثیلی رنگ میں عالم آخرت کا پیشگی مشاہدہ تھیں۔
> (ایضاً۔ صفحہ ۲۰)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضورؐ کو یہ سزائیں تمثیلی رنگ ہی میں دکھانی مقصود تھیں تو اس کے لئے حضورؐ کو آسمانوں کے اوپر، جہنم کے کنارے لے جانے کی (معاذ اللہ) کیا ضرورت تھی! کیا انہیں تمثیلی رنگ میں یہیں نہیں دکھایا جا سکتا تھا؟ آپؐ کو وہاں لے جانے سے تو مقصد ہی یہ ہو سکتا تھا کہ جو کچھ اہلِ جہنم پر بیت رہی ہے اس کا آپؐ بچشمِ خویش مشاہدہ فرما لیں۔

معراجِ نبویؐ کے سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

> اصل بات جو معراج کے سلسلہ میں سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب کی مناسبت سے مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان

بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کئے گئے تھے، تاکہ ان کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل ممیز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے۔ وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا۔ مگر انبیاءؑ جو کچھ کہتے ہیں وہ براہِ راست علم اور مشاہدے کی بناء پر کہتے ہیں۔ اور وہ خلق کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۲)

لاریب۔ نبی کا یہی مقام ہوتا ہے۔ لیکن یہ مابعد الطبیعیاتی حقیقتیں کسی خاص مقام میں مقید نہیں ہوتیں۔ جہاں سے جاکر نبی کو ان کا مشاہدہ کرایا جاتا تھا۔ جس طرح وحی کے علم کا مہبط اس کا قلب مطہر ہوتا تھا اسی طرح وہ ان حقیقتوں کا مشاہدہ بھی اپنے دل ہی کی آنکھ سے کرتا تھا۔ اسی بلند ترین مقامِ نبوت کو کمالات کا نقطۂ عروج یعنی معراج کہا جائے گا جس تک کوئی غیر از نبی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر اس سلسلہ میں روایات ہی کی طرف رجوع کرنا مطلوب ہو، تو پھر حضرت عائشہؓ کی اس روایت کو کیوں صحیح نہ مانا جائے جس میں انہوں نے فرمایا کہ: مَا فُقِدَ جَسَدُہٗ الشَّرِیْفُ وَلٰکِنْ اُسْرِیَ بِرُوْحِہٖ۔ "حضورؐ کا جسدِ مبارک مفقود نہیں ہوا تھا بلکہ آپؐ کی روح کو لے جایا گیا تھا" یہ بیان اقرب للحقیقت ہے لیکن مودودی صاحب اسے کس طرح صحیح مان سکتے ہیں جب ان کا مقصد ہی ذہن میں الجھاؤ پیدا کرنا ہے۔

شق القمر

مودودی صاحب نے "شق القمر" کا بھی ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں مشہور چلا آرہا ہے کہ مخالفین کی معجزہ طلبی پر حضورؐ کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور پھر یہ دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے۔ اسے معجزۂ شق القمر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب نے اس سے تو انکار کیا ہے کہ حضورؐ نے کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا تھا لیکن اس کا اعتراف کیا ہے کہ ایسا ہوا ضرور تھا۔ قدامت پرست حضرات کے نزدیک تو اس کا جواب نہایت آسان ہے کہ یہ معجزہ تھا اور معجزہ کی کوئی توجیہہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس اس پر ایمان لانا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت سے ایسا ہوا تھا۔ لیکن مودودی صاحب ایک تو اسے معجزہ تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرے اگر وہ قدامت پرست حضرات کی طرح اسے "خدا کی قدرت" کہہ کر آگے بڑھ جائیں تو ہمہ دان کیسے کہلائیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کی سائنٹیفک توجیہہ پیش فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے، اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۱ء۔ صفحہ ۲۵)

اس مجیر العقول "سائنٹیفک" توجیہہ پر مودودی صاحب کے حاشیہ نشینوں نے تو مرحبا، سبحان اللہ کے نعرے بلند کئے ہوں گے لیکن جب یہ توجیہہ مغرب کے سائنسدانوں کے سامنے جائے گی تو اس کا جس قدر مذاق اڑایا جائے گا اس کے احساس سے ہماری روح کانپ اٹھتی ہے۔ ہماری روح کے کانپ اٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے انہیں (معاذ اللہ) قرآن مجید کے مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آ جائے گا کہ قرآن اس قسم کی لایعنی باتیں کرتا ہے! میرے لئے یہ تو مشکل ہے کہ میں ضمنی طور پر یہ بیان کر سکوں کہ آسمانی کرّے کس طرح وجود میں آئے۔ وہ کس طرح اپنی موجودہ ہیئت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور کس قوت کی رو سے، اپنے اپنے فلک (مدار) میں، ایک خاص سمت میں کم و بیش دائرے کی شکل میں مصروف گردش ہیں[1]۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ کوئی کرّہ اپنے اندر کی آتش فشانی سے پھٹ نہیں سکتا۔ اور اگر وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو اس کی مرکز سے باہر کی طرف کھینچنے والی قوت ——— (CENTRIFUGAL FORCE) اتنی زبردست ہوتی ہے کہ مرکز کی طرف کھینچنے والی قوت (CENTRIPETAL FORCE) اس پر غالب ہی نہیں آ سکتی۔ اس لئے ان ٹکڑوں کے دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب یہ کرّے خدا کے قوانینِ طبیعی کے مطابق ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے تو پھر ان کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

مودودی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ "قرآن مجید اس واقعہ کو رسالتِ محمدی کی نہیں بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے" لیکن معترض پوچھ سکتا ہے کہ اس واقعہ کو گذرے چودہ سو سال ہو گئے لیکن قیامت ابھی تک نہیں آئی۔ تو پھر یہ "قربِ قیامت" کی نشانی کیسے قرار پائے گا؟

حضورؐ پر جادو کی تہمت

رسول اللہؐ کے خلاف، آپ کے مخالفین جو اتہامات گھڑا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ کہتے تھے کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے آپؐ (معاذ اللہ) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کا بالوضاحت تذکرہ کیا ہے جب کہا کہ ——— (و) يَقُولُ الظّٰلِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (۲۵/۸) "اور یہ ظالم تو یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ تم لوگ ایک ایسے آدمی کے پیچھے لگ رہے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے"۔ قرآنِ کریم کی اس شہادت کے بعد ہمیں اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ ؁ھ میں خیبر

---

[1] جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اگر ماہرین علم الافلاک کی ضخیم کتابوں کا مطالعہ نہ کر سکیں تو کم از کم محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی کتاب (PHENOMENA OF NATURE & QURAN) میں (SOLAR SYSTEM) سے متعلق باب ملاحظہ فرما لیں۔

سے یہودیوں کا ایک وفد آیا۔ اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا۔ جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمد (صلعم) پر ایک زبردست کا جادو کرو۔ اس زمانے میں ایک یہودی لڑکا حضورؐ کے ہاں خدمتگار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا۔ جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دانتوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا۔ اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کرایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنوئیں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلعم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا دوسری ششماہی میں کچھ تغیر محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور صلعم پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے جاتے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا ــــ اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا۔

(تفہیم القرآن - جلد ششم - ص۵۵۴)

جادو کے متعلق ہمارے زمانے میں کافی تحقیق ہو رہی ہے (میں نے اس باب میں مطالب الفرقان - جلد دوم میں تفصیل سے لکھا ہے) یہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زیادہ مضبوط قوتِ ارادی کے لوگ اپنا نفسیاتی اثر دوسروں پر ڈالتے ہیں اور اس سے وہی لوگ اثر پذیر ہوتے ہیں جو کمزور قوتِ ارادی کے مالک ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مودودی صاحب کے پیش کردہ واقعہ کی رُو سے حضورؐ کس قوتِ ارادی کے مالک نظر آتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالےٰ اسے کفار کی طرف سے عائد کردہ اتہام قرار دیتے ہیں اور مودودی صاحب (پناہ بخدا) کفار کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ واقعی رجلِ مسحور تھے۔

حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح

معاندینِ اسلام حضورؐ کی ازدواجی زندگی کو سب سے زیادہ موردِ اعتراضات قرار دیتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شدید اعتراض یہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایک چھ سالہ لڑکی (حضرت عائشہؓ) سے نکاح کیا اور نو سال

کی عمر میں اس کی رخصتی بھی عمل میں آ گئی۔ ایک کمسن لڑکی سے شادی عمومی نقطۂ نظر کے علاوہ خود قرآن کریم کے بھی خلاف ہے جس نے نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ ہمارے ہاں حضرت عائشہؓ کے چھ سال کی عمر میں نکاح کو ایک مسلّمہ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ میں نے ایک عرصہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد خود انہی حضرات کی مستند تسلیم کردہ کتب روایات و تاریخ سے یہ ثابت کیا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر، سترہ اور اُنیس سال کے درمیان تھی۔ (ملاحظہ ہو "طاہرہ کے نام خطوط") لیکن مودودی صاحب اس کے باوجود اس پر مصر ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال اور بوقتِ رخصتی نو سال تھی۔ باقی رہے اس پر اعتراضات تو ان کی تردید میں فرماتے ہیں کہ :-

> اس قسم کے اعتراضات صرف اسی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ رسول اللہؐ اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کو ایک عام مرد اور ایک عام عورت کا نکاح سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ حضورؐ اللہ کے رسول تھے جن کے سپرد انسانی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا اور معاشرے کو اس انقلاب کے لئے تیار کرنا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ ایک غیر معمولی قسم کی لڑکی تھیں جنہیں اپنی عظیم ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس انقلابی معاشرہ کی تعمیر میں حضورؐ کے ساتھ مل کر اتنا بڑا کام کرنا تھا جتنا دوسری تمام ازواجِ مطہرات سمیت اس وقت کی کسی عورت نے نہیں کیا... ان کے بچپن میں ان کی ان صلاحیتوں کا علم اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ اسی بنا پر اپنے رسول کی معیت کے لئے ان کا انتخاب اللہ تعالےٰ نے خود فرمایا...... جبریلؑ رسول اللہؐ کے پاس حضرت عائشہؓ کی تصویر سبز ریشم میں لائے اور آپؐ سے کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی بیوی ہیں۔ پس یہ انتخاب حضورؐ کا اپنا نہ تھا، بلکہ اللہ تعالےٰ کا تھا۔
>
> (ترجمان القرآن - ستمبر ۱۹۷۶ء)

سُن لیا آپؐ نے؟ باقی رہا یہ کہ نکاح کے لئے بلوغت کی شرط ہے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ :-

> صرف ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی قانون ہی نکاح کے لئے لڑکے اور لڑکی کی ایک خاص عمر مقرر کر سکتا ہے۔
>
> (ایضاً)

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور نکتہ پر بھی غور فرماتے جائیے۔ حضرت عائشہؓ کی جن عدیم المثال خداداد صلاحیتوں کا مودودی صاحب نے ذکر کیا ہے، اسی تسلسل میں وہ اس پر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہیں کہ :-

> گھریلو زندگی کے تمام خرخشوں اور مشغولیتوں سے فارغ ہو کر اپنی پوری بقیہ زندگی کو عورتوں اور مردوں میں اسلام اور اس کے احکام و قوانین اور اس کے اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں صرف کر کے اس عظیم ہستی نے کتنی بے بہا خدمات انجام دیں۔ علم حدیث کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ذریعے سے جتنا علم دین مسلمانوں کو پہنچا،

اور فقہ اسلامی کی معلومات حاصل ہوئیں اس کے مقابلہ میں عہدِ نبوت کی عورتیں تو درکنار مرد بھی کم ہی ایسے ہیں جن کی علمی خدمات کو پیش کیا جا سکے .... وہ صرف احادیث روایت کرنے والی ہی نہیں تھیں بلکہ فقیہہ، مفسّر اور مجتہد اور مفتی بھی تھیں ...... اکابر صحابہؓ ان سے مسائل پوچھتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی بعض مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا شمار مدینہ طیبہ کے ان چند علماء میں ہوتا تھا جن کے فتووں پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ (ایضاً - ص۲۳)

آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک حضرت عائشہؓ کا دین میں مقام کیا تھا۔ اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کے منصبِ صدارت کی امیدواری کی تائید و حمایت سے پہلے مودودی صاحب کے "اسلام" کا فیصلہ یہ تھا کہ عورت کے لئے امورِ سیاست میں حصہ لینا شرعاً ناجائز ہے۔ کسی نے اعتراض کر دیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو حضرت عائشہؓ، حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے میدانِ جنگ تک میں کیوں آ گئی تھیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے بے دھڑک کہہ دیا کہ "یہ حضرت عائشہؓ کی لغزش تھی جس کے اتباع کے ہم پابند ہیں۔ ان کے اس فعل کو جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دے دیا تھا۔ حضرت علیؓ سے بڑھ کر اس زمانے میں کون شریعت کا جاننے والا تھا[1]۔ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدودِ شریعت سے متجاوز ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو اس فتنے پر متنبہ کر دیا تھا" (ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء۔ اشارات) یعنی جس (حضرت) عائشہؓ کے متعلق پہلے کہا ہے کہ جلیل القدر صحابہؓ تک ان سے علومِ دین کے مسائل پوچھنے اور فتوے لینے جایا کرتے تھے، انہی کے متعلق اب کہا جا رہا ہے کہ تمام صحابہؓ ان کے اقدام کو شریعت سے تجاوز اور خود رسول اللہؐ کی تنبیہہ کی خلاف ورزی قرار دیتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس جنگ کی سربراہی سے باز نہ آئیں۔

یہ ہیں مودودی صاحب کے تضادات!

کثرتِ ازواج

حضورؐ کی ازدواجی زندگی کے متعلق دوسرا اعتراض حضورؐ کی کثرتِ ازواج پر کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب ـــــ معراجِ انسانیت ـــــ میں بتایا ہے کہ اس کا جذبۂ محرکہ جنسی تحرک نہیں تھا۔ یہ تو مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے پیدا شدہ حالات کی بنا پر، ان سن رسیدہ بیکس و بے بس، خواتین کے لئے باعزت سامانِ تحفظ بہم پہنچانا تھا ـــــ لیکن ہمارے یہ تمام دلائل ایک

---

[1] جب مودودی صاحب کو ضرورت پیش آئی تو انہوں نے حضرت علیؓ کے امیدوارِ خلافت ہونے کو بھی ان کی لغزش قرار دے دیا تھا ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟

طرف، اور وہ روایت دوسری طرف جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ اپنی تمام (گیارہ) ازواج کا دورہ ایک رات میں کر لیا کرتے تھے۔ اور جب حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی۔ ایک صاحب نے مودودی صاحب سے اس روایت کے متعلق دریافت کیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے! اس کے جواب میں مودودی صاحب لمبی چوڑی بحث کے بعد نتیجۃً لکھتے ہیں کہ :-

حضورؐ ایک کامل انسان تھے۔ تمام قوتیں آپ کے اندر غایت درجہ کے اعتدال پر تھیں......

.... ایک اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھنے والے انسان میں رجولیت کی قوت کا بھی کمال درجہ پر ہونا ایک طبّی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

(تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۴۸۔ ایڈیشن کا سال درج نہیں۔ غالباً یہ پہلا ایڈیشن ہے۔)

قطع نظر دیگر امور، مودودی صاحب جب اس قسم کی مضحکہ انگیز باتیں کرتے ہیں تو ان کی دماغی حالت کے متعلق شبہ گزرنے لگتا ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ صاحب اپنے کاروبار میں کس قدر زیرک اور چابکدست واقع ہوئے ہیں تو اسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ اس قسم کی باتیں جان بوجھ کر کرتے ہیں! انہوں نے کہا ہے کہ "ایک اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھنے والے انسان میں رجولیت کی قوت کا بھی کمال درجہ پر ہونا ایک طبّی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔" کیا ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس "ناقابلِ انکار، مسلّمہ طبی حقیقت" کا ان کے پاس ثبوت کیا ہے؟

پھر، بات اس قوت کی موجودگی کی نہیں۔ سوال اس کے استعمال کا ہے؟ اعلیٰ دماغ رکھنے والے لوگ جن کے سامنے زندگی کے بلند نصب العین یا تخلیقی مقاصد ہوں، جنسی اختلاط کی طرف تو ان کا خیال ہی شاذ و نادر جاتا ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ جنسی جذبہ، بھوک یا پیاس کی طرح ازخود نہیں ابھرتا۔ اسے خیال اور خواہش کے ذریعے بیدار کرنا ہوتا ہے۔ جس برگزیدہؐ ہستی کے پیشِ نظر عالمِ انسانیت میں عدیم النظیر انقلاب برپا کرنا تھا، کیا وہ بطنِ عظیم (پناہ بخدا) اس طرح اپنے جنسی جذبہ کو بیدار کرتا اور پھر اس کی تسکین کا انتظام کرتا ہوگا۔ حضورؐ کی تو کیفیت یہ تھی کہ آپ دن بھر اپنی انقلاب آفریں تگ و تاز میں مصروف رہتے اور پوری پوری رات اس پروگرام پر غور و خوض میں گزار دیتے۔ یہاں تک کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا پڑا کہ: قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۔ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۔ "اے رسول! تم راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ آدھی رات تک بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لئے کہ: إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۔ (۷۳/۷) دن میں تیرے سامنے بڑے طویل پروگرام ہوتے ہیں۔ تمہیں ان سے بھی عہدہ برآ ہونا ہوتا ہے۔" کہتے ہوئے حیا دامنگیر ہو جاتی ہے لیکن سوچئے کہ جو شخص (مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) ایک رات میں گیارہ یا آٹھ بیویوں سے ہم بستر ہو وہ صبح کو کسی کام کے قابل بھی رہ سکتا ہے؟

لیکن مودودی صاحب کو ان حقائق سے کیا غرض۔ انہیں تو معاندینِ اسلام کو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف اختراعات کا مواد بہم پہنچانا ہے، سو وہ پہنچا رہے ہیں۔

مقطوع الذکر والی روایت

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ بھی مودودی صاحب نے بیان فرمایا ہے جسے ہم دل پر پتھر رکھ کر سامنے لانے کی جرأت کرتے ہیں۔ اسے انہوں نے سوال اور جواب کی شکل میں بیان کیا ہے۔ پہلے سوال کو دیکھئے:۔

سوال:۔ منکرینِ حدیث مسلم شریف کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی اُمِ ولد ماریہ قبطیہ سے زنا کرنے کا الزام ایک شخص پر لگایا گیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ ملزم کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ تلوار لے کر اس شخص کو قتل کرنے گئے تو وہ غسل کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ وہ مخنث تھا۔ آپ واپس چلے آئے اور آنحضرتؐ کو واقعہ سنا دیا۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) آنحضرتؐ نے محض الزام کی بنا پر، مقدمہ کی کارروائی کے بغیر، اور ملزم کی صفائی سنے بغیر اس کے قتل کرنے کا حکم کیسے دیا، حالانکہ یہ اسلام کی مجموعی اسپرٹ اور ان احادیث کے خلاف ہے جن میں اسلام کا عدالتی نظام بیان ہوا ہے۔

(۲) زنا کی سزا دُرّے ہے یا رجم (اگرچہ منکرینِ حدیث رجم کے قائل نہیں) پھر قتل کی سزا مذکورہ مقدمہ میں کیوں دی گئی۔ (سوال ختم ہوا)

سوال آپ نے سُن لیا۔ قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب مودودی صاحب کی "زبانِ مبارک" سے سنیں، یہ ملاحظہ فرمائیے کہ اس قسم کے اختراعات کرنے والوں کا وہ کس قدر شائستہ اور مہذّب انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

> اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں اور نہ اس قماش کے لوگ اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔

"اللہ کے اس شاہکار" کے مریدانِ باصفا اکثر کہا کرتے ہیں کہ مودودی صاحب کے مخالفین اُن کی شانِ اقدس میں ہزار کچھ بکیں، مودودی صاحب ان کے متعلق کوئی غیر شریفانہ کلمہ تک بھی نہیں کہتے وہ حضرات ذرا مندرجہ بالا الفاظ کو پڑھیں اور سوچیں کہ یہ کس شرافت اور شائستگی کے آئینہ دار ہیں؟ لیکن مریدوں پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں کے تصوف میں ایک فرقہ "ملامتیہ" بھی ہوتا ہے۔ اس میں "حضرت صاحب" کی ہر غیر اخلاقی حرکت سے ان کے مریدوں کی

عقیدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی کیفیت مودودی صاحب کے مریدوں کی ہے۔

اس کے بعد مودودی صاحب کا جواب ملاحظہ فرمائیے:۔

جس واقعہ کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ حضرت ماریۂ قبطیہ کے بارے میں مدینہ کے منافقین نے یہ افواہ اڑا دی تھی کہ اپنے چچازاد بھائی سے ان کا ناجائز تعلق ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی پہنچی۔ آپؐ نے حضرت علی رضؓ کو حکم دیا کہ " اذ ھب فان وجدتہ عند ماریۃ فاضرب عنقہ "۔ " جاؤ اگر تم اس کو ماریہ کے پاس پاؤ تو اس کی گردن مار دو"۔ بعید نہیں کہ کہنے والے نے حضورؐ سے یہ کہا ہو کہ وہ وہاں اس وقت موجود ہے، آپؐ کسی کو بھیج کر دیکھ لیں، اور اس پر حضورؐ نے فرمایا ہو کہ اگر وہ وہاں کسی غیر مناسب حالت میں پایا جائے تو جان سے مار دو۔ اس حکم کے مطابق حضرت علی رضؓ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک حوض میں نہا رہا ہے۔ آپؓ نے جاتے ہی اُسے ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کر اسے حوض میں سے کھینچ لیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص پانی سے بھرے ہوئے حوض میں اترا ہو اس کے بارے میں باہر سے دیکھنے والے کو بایک نظر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ ننگا ہے یا ستر ڈھانکے ہوئے ہے۔ جب حضرت علی رضؓ نے اس کو باہر کھینچا تو یکایک آپ کی نظر اس کے ستر پر پڑی اور معلوم ہوا کہ وہ تو مقطوع الذکر ہے۔ آپ نے اسی وقت اسے چھوڑ دیا اور آ کر حضورؐ کو حقیقتِ حال بتا دی۔

اب فرمائیے کہ اس واقعہ پر کیا اعتراض ہے اور کس پہلو سے ہے؟ یہ بات بھی عرض کر دوں کہ سند کے لحاظ سے یہ روایت ضعیف نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم۔ ستمبر ۱۹۶۴ء ایڈیشن۔ ص ۵۵-۵۴)

میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اس جواب سے، ان اعتراضات کا ازالہ ہو گیا جن کا ذکر مستفسر نے اپنے سوال میں کیا تھا، اور کیا اس سے وہ غیر مسلم بھی مطمئن ہو جائیں گے جو اس قسم کی وضعی روایات سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ پر (معاذ اللہ) طعن کیا کرتے ہیں؟

انبیاءؑ کی معاذ اللہ لغزشیں

اب ایک اور جانگداز سانحہ کی طرف آیئے۔ حضرات انبیاء کرامؑ چونکہ وحی خداوندی کا کامل اتباع کرتے تھے اس لئے ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی جسے لغزش کہا جا سکے۔ تدبیری امور میں بعض اوقات کسی خامی یا اجتہادی سقم کا رہ جانا اور بات ہے، لیکن اسے لغزش نہیں کہا جا سکتا۔ مودودی صاحب انبیاء کرامؑ سے لغزش کے صدور کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن سنیئے کہ وہ اس کی توجیہہ کیا بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

میرا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں (کرتے تھے!) اس لئے ان سے لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا بلکہ اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں۔ خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں۔ (رسائل و مسائل - حصہ چہارم - سستا ایڈیشن - صفحہ ۴۲)

غور فرمائیے کہ جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے اس سے انسان کن نتائج پر پہنچتا ہے؟ اوّل تو یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ سے اگر لغزشیں صادر نہیں ہوتی تھیں تو اس میں ان کی سیرت و کردار کا کوئی کمال نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے لغزشیں صادر ہونے ہی نہیں دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان سے لغزشیں صادر کرا دیتا تھا —— معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ہدایت دیتا اور انہیں لغزشوں سے محفوظ رہنے کے طور طریق بتاتا اور ایسا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کسی سے لغزشیں صادر نہیں کراتا —— اور وہ بھی حضرات انبیاء کرامؑ سے ......!

پھر اس میں یہ بھی دیکھئے کہ حضرات انبیاءؑ کو (معاذ اللہ) کس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا —— لغزشیں ان سے اللہ تعالیٰ صادر کراتا تھا۔ لوگ ان لغزشوں کو دیکھتے تھے اور بہرحال انہیں، انہی کی لغزشیں قرار دیتے تھے۔ ان کے پاس اس بات کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ان لغزشوں کے ذمہ دار ہم نہیں۔ خدا ہے۔ حتیٰ کہ وہ، یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ کس قدر (معاذ اللہ) مجبوری تھی خدا کے ان برگزیدہ بندوں کی! حافظ نے (اپنے عقیدۂ جبریت کی بنا پر) کہا تھا کہ: ؎

گناہ گرچہ نبود از خطائے ما، حافظ — تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

کچھ ایسی ہی حالت ان انبیاء کرامؑ پر (معاذ اللہ) گزرتی ہوگی۔

باقی رہی وہ مصلحت جس کے لئے (بقول مودودی صاحب) اللہ تعالیٰ - انبیاء کرامؑ سے لغزشیں صادر کرا دیا کرتا تھا —— یعنی یہ کہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں۔ خدائی صفات کے حامل نہیں۔ تو اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دے دیا کہ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اِنَّهُمْ يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ (۲۵/۲۰)۔ وہ (عام لوگوں کی طرح) کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ یہ بدیہی حقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ انبیاءؑ انسان ہی ہوتے ہیں۔ فوق البشر نہیں۔ اور پھر خود حضرات انبیاء کرامؑ کا بار بار اعلان کہ: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں) اسی حقیقت کا اظہار تھا۔

خدا اور اس کے رسولؐ تو یہ شہادت پیش کرتے ہیں لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ شہادت کافی نہیں۔ اس بات کے ثبوت کے لئے کہ یہ حضرات انسان ہیں خدا ان سے لغزشیں صادر کرا دیا کرتا تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے کلیجہ میں ٹھنڈک ہی نہیں پڑتی جب تک وہ دوسروں کی لغزشیں نہ ثابت کر دیں۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی (معاذ اللہ) لغزشیں۔ صحابہ کرامؓ کی لغزشیں۔ بلند پایہ مومنین کی لغزشیں ـــــ ان کے نزدیک، لغزشوں سے منزہ صرف ایک ہستی ہے۔ اور وہ ہے خود ان کی اپنی ذات۔ چنانچہ انہوں نے آج تک کبھی یہ نہیں کہا کہ ان سے بھی لغزشیں سرزد ہوتی رہی ہیں، یا ہو جاتی ہیں۔ نہ ہی ان کے معتقدین نے کبھی اس کا اعتراف کیا ہے!

اب آخر میں آپ اس وادی کی طرف آئیے جس میں، بقولِ کسے، قدم رکھتے ہوئے فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ اصول پرستی انسانی کیریکٹر کی اصل و اساس ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے اصولوں پر پختگی کا پابند ہو وہ قابلِ اعتماد اور مستحق تحریم و تکریم سمجھا جاتا ہے۔ اصول شکن آدمی کو کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ یہ تو عام انسانوں کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ میں یہ جوہر اپنے انتہائی کمال تک پہنچا ہوتا تھا۔ ان کے متعلق ان کے مخالفین تک کو کامل یقین اور پورا پورا اعتماد ہوتا تھا کہ وہ کسی حالت میں اور کسی قیمت پر بھی اصول شکنی نہیں کریں گے۔ لیکن دیکھئے مودودی صاحب اس باب میں، حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ سنئے، اور جگر تھام کر سنیئے۔

کوئی بیس سال اُدھر کا ذکر ہے، ان کی جماعت کے بعض ممتاز حضرات نے ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے جماعت سازی کے وقت جن بلند آہنگ اصولوں کو پیش کیا تھا، اب عملی سیاست میں پہنچ کر ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کہہ رہا ہوں تو کونسے جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں، (توبہ توبہ، معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

رسول اللہؐ کی معاذ اللہ اصول شکنی

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش۔ "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ سستا اڈیشن۔ صفحہ ۳۲۹-۳۳۰)

میں نے جی کڑا کر کے اسے پیش تو کر دیا ہے لیکن اس پر اس کے سوا کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کہ جس

شخص کو ناموسِ رسالت کا ذرہ بھر بھی احساس ہے وہ اس قسم کی گستاخی کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا۔
لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ آگے بھی چلتی ہے۔ مودودی صاحب کے خلاف یہ الزام بھی

جھوٹ بولنا

عائد کیا گیا کہ وہ غلط بیانی سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ:۔

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد، عزتِ ناموسِ رسالت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ ص ۵۴-۵۵)

یہ ہیں عزیزانِ من! حضورؐ کی اس سیرتِ طیبہ کے کچھ نمونے جسے یہ "عصرِ حاضر کے مجددِ اعظم" مرتب فرما رہے ہیں۔ جب یہ سیرت مکمل ہو جائے گی تو (ان کی تفسیر کی طرح) انٹرکانٹی نینٹل اور میٹروپول ہوٹلوں میں اس کی تعارفی تقاریب منعقد ہوں گی۔ خوشامد پرست "دانشور" (اسے بغیر دیکھے اور پڑھے) اس کی حمد و ستائش میں قصائد پڑھیں گے۔ اس کے بعد مغربی زبانوں میں اس کے تراجم ہوں گے۔ اور اسے مستند ترین سیرت قرار دیا جائے گا۔ (عمرِ طبیعی کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ) یہ مودودی صاحب کے نامۂ سیاہ کا آخری عمل ہوگا اور اس طرح وہ سازش اپنی تکمیل تک پہنچ جائے گی جس کے پیچھے نہ معلوم کون کونسی معاند اسلام قوتیں کارفرما ہیں۔

میں آخر میں پھر عرض کروں کہ جب ان کے معتقدین اور خوشامد پرست مصاحبین سے پوچھا جائیگا تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ مودودی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ یہ تمام واقعات کتبِ روایات میں موجود ہیں۔ مودودی صاحب کا قصور اتنا ہی ہے کہ انہوں نے انہیں ترتیب دیکر یکجا کر دیا ہے۔

مودودی صاحب اور روایات

اس کے جواب میں، میں پھر دہرا دوں کہ جن حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ کتب احادیث (کم از کم صحاح ستہ) میں جو روایات درج ہیں ہم ان کے صحیح ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی تنقید جائز نہیں سمجھتے۔ یہ حضرات اپنے اس عقیدہ کی رو سے ان روایات کو صحیح ماننے پر معذور ہیں۔ اس وقت میں ان سے مخاطب نہیں۔ اس وقت میرے مخاطب مودودی صاحب ہیں جن کی کیفیت یہ نہیں۔ وہ کتب احادیث میں درج شدہ کسی حدیث کو بھی محض اس لئے صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ائمہ حدیث نے اسے صحیح قرار دیدیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(رسائل و مسائل حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۹)

وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ:-

یہ دعویٰ کرنا (بھی) صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس مجبوری کے تحت نہیں لکھا کہ کتب احادیث میں ایسا آیا ہے اور وہ ہر روایت کو صحیح ماننے پر مجبور ہیں۔ انہوں نے ان روایات کو اس بنا پر درج کیا ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی بنا پر انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

اور جس شخص کی بصیرت اسے اس قسم کی روایات کو صحیح ماننے پر آمادہ کرے، اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ خدا، ناموسِ رسالت کو اس قسم کے معاندین کے شر سے محفوظ رکھے۔ کبھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہماری تاریخ میں عبداللہ بن سبا اور حسن بن صباح جیسے لوگ اس قسم کے باطل اور لغو معتقدات پھیلانے میں کس طرح کامیاب ہو گئے۔ اب یہ بات سمجھ آئی ہے کہ معاندین اسلام کن کن ذرائع سے اپنی سازشوں کو کامیاب کراتے ہیں۔

یاد رکھئے۔ جس طرح قرآنِ مجید کو پوری صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے لانا ضروری ہے اسی طرح سیرت رسول اللہؐ کو بھی نہایت پاکیزہ اور منزہ شکل میں پیش کرنا اُمت کا فریضہ ہے۔ حضورؐ کی سیرت، قرآن مجید کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔ لہٰذا آپؐ کی سیرت کے صحیح اور منزہ ہونے کا معیار قرآن مجید ہے۔ ہماری کتب روایات و تاریخ میں جو ایسے واقعات حضورؐ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں یا جن سے حضورؐ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہوتی ہے، ان کا مسترد کر دینا ضروری ہے۔ اسی قسم کی ہیں وہ روایات جن کے متعلق میں کہتا ہوں کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت درست نہیں۔ انہی روایات کا میں انکار کرتا ہوں۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں اور حضورؐ کی سیرت و کردار کو بلند ترین مکارمِ اخلاق کا مظہر قرار دیتی ہیں، وہ میرے نزدیک سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ میری مرتب کردہ کتاب سیرت (معراجِ انسانیت) میری اسی کوشش کا نتیجہ ہے اور بفضلِ ایزدی بڑی مقبول ہوئی ہے۔ یاد رکھئے! قرآنِ مجید اور اس کے مطابق سیرتِ طیبہ وہ نورانی شمعیں ہیں جو انسانیت کے تاریک راستوں کو منور کرتی ہیں اور منور کرتی رہیں گی۔ اس کے خلاف جو سعی مذموم بھی کی جائے گی وہ ناکام و نامراد رہے گی اور اس کے مرتکب دنیا اور آخرت دونوں میں روسیاہ ——— واللہ علیٰ ذالک شہید۔

حقائق و عبر

۱۔ کارِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

اس سے پہلے ہمارے ہاں کے مذہبی "مُوتمراش" بالعموم مسلم ممالک، مثل انڈونیشیا، ملایا، افریقہ جایا کرتے اور وہاں سے جھولیاں بھر بھر کر لایا کرتے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے انہوں نے مغربی ممالک کا بھی رُخ کیا ہے۔ کیونکہ ان ممالک میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہو گئی ہے۔ وہاں سے بھی انہیں نمایاں "فتوحات" حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جہاں سے فتوحات حاصل ہوں وہاں ان "خدام الاسلام" کی باہمی سر پھٹول ناگزیر ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے ایک بار لکھا تھا کہ انگلستان میں بریلویوں اور دیوبندیوں کے جھگڑے اور فسادات کی شدت اختیار کر رہے ہیں۔ (طلوع اسلام جنوری ۱۹۷۶ء) اب وہاں "جمعیت تبلیغ اسلام" اور حنفیہ میں فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل خبر قابلِ توجہ ہے جسے ہم، ہمعصر المنبر (لائل پور) کی اشاعت بابت ۱۴ — ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء کے حوالے سے درج کرتے ہیں۔

بریڈ فورڈ (نمائندہ جنگ) بریڈ فورڈ کے مجسٹریٹ نے آج "جمعیت تبلیغ اسلام" کے جلسہ میں چاقو زنی کے الزام میں گرفتار حق نواز کو ضمانت پر رہا کرنے کی درخواست مسترد کر دی ہے، اور انہیں ہفتہ کے لئے پولیس کی تحویل میں دینے کا حکم دیا ہے۔

حق نواز اور نواز کو گزشتہ اتوار کو گرین لین اسکول میں مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام کے جلسہ میں جمعیت اور مسجد حنفیہ کے حامیوں کے درمیان مسجد کی تعمیر کے جھگڑے پر گرفتار کیا گیا تھا جس میں چاقو اور کرسیاں چل گئی تھیں جس سے پانچ افراد زخمی ہو گئے تھے۔

اس جلسہ میں (جو جمعیت تبلیغ الاسلام کی مذہبی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے بلایا گیا تھا) ایک قرارداد پیش کی گئی کہ:۔

> بریڈ فورڈ کونسل نے ایک مسجد تعمیر کرنے کے لئے جو زمین مسجد حنفیہ کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی اصل حقدار "جمعیت تبلیغ الاسلام" ہے۔

اس قرارداد میں فورڈ کے پاکستانی کونسلیٹ پر چند الزامات عائد کئے گئے تھے۔ جس پر ہنگامہ ہو گیا اور چاقو اور چھریاں چل گئیں۔ (۲۴ نومبر ۷۶ء) اور یہ ہے اس خبر پر ہفتہ وار "آزاد" لندن کا تبصرہ:۔

بریڈ فورڈ (نمائندہ آزاد) یہ بات انتہائی دکھ، کرب اور افسوس کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ

بریڈفورڈ جو پُرامن پاکستانیوں کا گڑھ ہے وہاں گرین لین سکول میں مسجد حنفیہ اور تبلیغ الاسلام کے حامیوں کے درمیان تشدد اور مارکٹائی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ بات قابلِ مذمت ہے جبکہ دونوں تنظیمیں ایک ہی علاقے کے افراد پر مشتمل ہیں۔

جو ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن پاک پر یقین رکھتے ہیں اُن کی جانب سے تشدد کے ایسے گھٹیا مظاہرے سے نہ صرف پاکستان اور پاکستانیوں کے وقار کو نقصان پہنچا ہے بلکہ اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے نظریات بھی متزلزل ہوئے ہیں۔

ایک مذہبی تقریب جس کے سرکار دینِ مبین اور اسلام کی سربلندی کے نام لیوا ہیں، وہاں کرسیوں اور چاقوؤں سے ایک دوسرے کو گھائل کرنے کا کھیل کھیلا جائے تو اسلام کی عظمت اور تقدس کو پائمال کرنے کے مترادف ہے جبکہ اسلام صلح جوئی، امن، رواداری، ہمدردی اور تعاون کا درس دیتا ہے۔

ہنگامے کو فرو کرنے کے لئے پولیس آئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ اس سانحہ سے پاکستانیوں کا سر ندامت سے جھک جانا چاہیئے۔ بریڈفورڈ کے پاکستانیوں کو اتحاد و یگانگت کی مثال قائم کرکے اپنی روایات کو زندہ رکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن انتہائی دکھ اور کرب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ:

ملّت خرافات میں کھو گئی

بریڈفورڈ میں گرین لین سکول میں عموماً پاکستانیوں کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس افسوسناک واقعہ کے بعد اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ پاکستانیوں کو اپنی تقریبات کے انعقاد کے لئے یہ جگہ نہیں ملا کرے گی۔

اس پر بھی ہمیں تلقین کی جاتی ہے کہ انہیں فرقے مت کہو، مکاتبِ فکر کہو۔

۲۔ مکاتبِ فکر کی ایک اور مثال

انتخابات کے سلسلہ میں مختلف پارٹیوں کا جو اتحاد ہوا ہے، ان میں سے تین مذہبی جماعتوں کے اس "اتحاد" پر تنقید کرتے ہوئے، محترم کوثر نیازی صاحب نے کہا ہے کہ:

اگر مفتی محمود۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا مودودی، جیکب لائنز (کراچی) کی جامع مسجد میں اکٹھے نماز پڑھ لیں تو وہ پیپلز پارٹی کے امیدوار سینیٹر کمال اظفر سے کہیں گے کہ وہ اس حلقے سے دستبردار ہو جائیں۔ (نوائے وقت - ۷، فروری ۱۹۷۷ء)

یہ ہے ان فرقوں سے وابستہ حضرات کے باہمی اختلاف کی شدت کا عالم۔ اور اس کے باوجود یہ "فرقے" نہیں "مکاتبِ فکر" ہیں!

۳۔ دے جا بابا! اللہ کے نام پر

کسی کے ہاں شادی ہو یا مرگ، بھک منگوں کی بہرحال چاندی ہوتی ہے۔ یہی کیفیت جماعتِ اسلامی کی ہے۔ ملک میں کوئی حادثہ نمودار ہو، یا کوئی ہنگامہ خود کھڑا کر دیا جائے، یہ جماعت، تحفظِ دین کے نام پر جھولی پھیلا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ملک میں انتخابات کی گہما گہمی ہے۔ جماعت اسلامی کے لئے یہ موقعہ ازبس غنیمت ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے ایک اپیل شائع کی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

> حالیہ انتخابات عام میں قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی ملک کی دوسری حزبِ اختلاف کی جماعتوں کے ساتھ متحد ہو کر اپنے حصے کے نمائندے کھڑے کر رہی ہے۔ لیکن جماعت اور اس کے کارکنوں سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ جماعت کے پاس مخلص، محنتی، دیانتدار اور فرض شناس افراد اور کارکن تو بہت موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثر متوسط اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے انتخابات کے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں ایک ایک حلقہ انتخاب کے لئے اخراجات کا جو اندازہ قانون میں رکھا گیا ہے۔ اور جو سرکاری پارٹی اور عام امیدواروں کے اخراجات کا شائد چند فی صدی ہوگا۔ اس کے حساب سے بھی لاکھوں روپے کی ضرورت ہے اس لئے میں ملک کے تمام باشندوں سے خواہ وہ پاکستان کے اندر ہیں یا باہر، اپیل کرتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اور جلد از جلد جماعت کی مالی معاونت فرمائیں اور جماعت اور اس کی حلیف حزبِ اختلاف کی جماعتوں یعنی پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدواروں کو اپنا ووٹ دے اور دلوا کر کامیاب بنانے کی بھی پوری کوشش کریں۔ (ایشیاء - بابت ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء - صفحہ اول)

مثل مشہور ہے کہ "مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام"۔ جماعتِ اسلامی کو انتخابات میں کوئی نشست ملے یا نہ ملے، اس بہانے فنڈ تو اکٹھا ہو ہی جائے گا! اقامتِ دین کا قصرِ مشید بھی کن کن ستونوں پر استوار ہوتا ہے!! انتخاب خود لڑتے ہیں اور اسلام کے نام پر چندے قوم سے مانگتے ہیں۔

ضروری اعلان

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے ورنہ تعمیل نہیں ہو گی۔
(۲) ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر پرچہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔ اس کے بعد کیتناً بھیجا جائے گا۔
(۳) خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (ناظم ادارہ)

شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے!

۱۔ من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن، دیگر اہلِ مذاہب کے، خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن، خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۲۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کش مکش، شیطان، ملائکہ، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور، علومِ حاضرہ کی روشنی میں۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۳۔ جوئے نور

حضرات انبیاء کرامؑ اور اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں، آسمانی انقلاب کے خلاف مفاد پرست گروہوں کا محاذ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔

(حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک)

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۴۔ برقِ طور

صاحبِ حرب کلیمؑ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل۔ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول۔ شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہوسکتی؟ ارضِ مقدس کی داستان۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۵۔ شعلۂ مستور

حضرت مریمؑ اور حضرت عیسےٰؑ کے کوائفِ حیات۔ کیا حضرت عیسےٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ واقعۂ تصلیب کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم اور عصرِ حاضر کے محققین کے نزدیک بصیرت افروز حقائق۔ حقیقت کتنا معلوماتی۔

قیمت مجلد۔ پچیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

۶۔ ختمِ نبوت اور "تحریکِ احمدیت"

مقامِ نبوت کیا ہے؟ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالتِ محمدیہ کس طرح ابدیت در کنار ہے۔ "آنے والے" کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا؟ تحریکِ "احمدیت" کی اصل و حقیقت اور غرض و غایت۔ "احمدی" لٹریچر کا بے لاگ تجزیہ اور نتیجہ۔ بڑی اہم کتاب ہے۔

قیمت مجلد۔ پندرہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

شہابِ ثاقب غروب ہو گیا

(پرویز)

۹ فروری (۱۹۷۷ء) کی شب، ٹیلی ویژن سے یہ جگر پاش خبر فضا کو چیر گئی کہ خواجہ شہاب الدین صاحب کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب ایک فرد نہیں تھے۔ ایک عہد کی تاریخ تھے جو افسوس کہ منوں مٹی میں مدفون ہو گئی۔

خواجہ صاحب (مرحوم) کے ساتھ میرا تعارف تو تحریکِ پاکستان کے زمانے سے تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد جب وہ امورِ داخلی کے وزیر تھے تو ان سے میرا ملازمتی رابطہ رہا۔ لیکن ان سے فکری تعلق اس زمانے سے شروع ہوا جب وہ سعودی عرب (اور بعد میں مصر) میں سفیر تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے میری تصانیف کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا۔ ان کی ابتدائی زندگی میں ان پر قدیم مذہبیت کا گہرا رنگ تھا اور یہ ظاہر ہے کہ مذہب سے دین کی طرف آنے میں جن خاردار جھاڑیوں میں دامن الجھتا ہے ان سے محفوظ نکل آنے کیلئے بڑے گہرے غور و فکر اور ضبط و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب ان دامنگیر جھاڑیوں سے بحفاظت نکل آئے اور جب وہ پاکستان واپس آئے ہیں تو وہ قرآنی فکر کا پختہ رنگ لئے ہوئے تھے۔ اس سلسلہ سے ان کے ساتھ میرے روابط گہرے ہوتے چلے گئے۔ (صدر) ایوب خاں (مرحوم) کے زمانے میں، جب خواجہ صاحب، شعبۂ اطلاعات و براڈ کاسٹنگ کے وزیر تھے، میرا اکثر اسلام آباد جانا ہوتا تھا اور وہاں میرے وقت کا بیشتر حصہ انہی کی معیت میں گذرتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس میں موضوع گفتگو قرآن کریم ہی کے حقائق و معارف ہوتے تھے۔ اسی بہت سے انہیں میری قرآنی تحریک سے بھی دلی وابستگی تھی۔ یہ وہ دور تھا، جب مولوی صاحبان کی طرف سے میری مخالفت بڑی شدید تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ان حضرات کے پروپیگنڈہ کے اچھالے ہوئے کیچڑ سے بچنے کے لئے، میرے اکثر ملنے والے (بلکہ بعض ہم فکر احباب تک) مجھ سے ملنے جلنے میں تامل برتتے تھے۔ لیکن خواجہ صاحب نے کبھی ایسی مذاہنت اختیار نہ کی اور میرے ساتھ علی الرغم قدیمی تعلقات برملا استوار رکھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے نومبر ۱۹۶۷ء میں، طلوعِ اسلام کنونشن کے ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی۔ اس اجلاس میں میرے خطاب کا عنوان تھا۔ "انسانیت کا آخری سہارا" انہوں نے اس خطاب کو نہ صرف پورے جذبات و انہماک کے ساتھ، بلکہ باچشمِ نم، سماعت فرمایا اور اس کے بعد جو صدارتی کلمات ارشاد فرمائے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت تھے کہ انہیں قرآنی فکر کے ساتھ کس قدر گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے وہ ارشادات، طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئے تھے

لیکن اس وقت میرے دلِ محزوں کا تقاضا ہے کہ انہیں ایک بار پھر سامنے لایا جائے کہ یہی ان تابندہ ترین یادگار ہے۔ انہوں نے فرمایا:۔

میں ادارہ طلوعِ اسلام کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے کونشن کے اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دی، اور اس اجلاس کی صدارت سے نوازا۔ اس تقریب میں شرکت میری زندگی کے یادگار واقعات میں سے ہوگی۔

مجھے محترم پرویز صاحب سے ایک عرصہ سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور اگر مرکزی حکومت سے وابستگی کے سلسلہ کو نسبت قرار دیا جائے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق!
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

لیکن ان کے ساتھ معنوی تعارف ان کی قرآنی فکر کے ذریعے ہوا۔ اور یہ وہ تعارف ہے کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ جس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں نہ صرف یہ کہ کوئی تامل نہیں بلکہ فخر ہے کہ میں نے ان کی قرآنی فکر سے بہت استفادہ کیا ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ یوں تو ان کی تصنیفات میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو بلند علمی پایہ کی نہ ہو، لیکن میری بصیرت کے مطابق، ان میں ان کی "لغات القرآن" اور "مفہوم القرآن" یقیناً صدیوں تک زندہ رہیں گی۔

لیکن علمی تصنیفات کے علاوہ پرویز صاحب کی عملی خدمات بھی کچھ کم مستحقِ ستائش نہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہمیں ہندو اور انگریز کے خلاف جو جنگ لڑنی پڑی تھی وہ بجائے خویش بڑی ہمت طلب تھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مہیب لڑائی وہ تھی جو اس تحریک کی مخالفت کرنے والے علماء کے ساتھ لڑنی پڑی۔ (ضمناً، یہی لوگ جنہوں نے اس زمانے میں تحریکِ پاکستان کی اس تندر مخالفت کی تھی، اب پوری ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اس کی قطعاً مخالفت نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ، تحریکِ پاکستان کے حامیوں کو جنت الحمقاء میں بسنے والے بتایا کرتے تھے۔ بہرحال محترم پرویز صاحب نے ان کے خلاف سخت لڑائی لڑی۔ اس لڑائی میں انہوں نے جس معرکہ آرائی کا ثبوت دیا، طلوعِ اسلام کے اس زمانے کے فائل اس پر شاہد ہیں —— اور یہ وہ زمانہ تھا جب پرویز صاحب انگریزوں کی حکومت میں ہندوؤں کے ماتحت ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ ان حالات میں اس قسم کی کھلی ہوئی جنگ کرنا انہی کا کام ہے۔ لیکن ان کی یہ جنگ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔ یہ اب تک جاری ہے۔ اب ان کی یہ جنگ ہے قدامت پرستی کی تاریکیوں کے خلاف جہادِ مسلسل۔ اس جنگ میں بھی ان کا انداز منفرد ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ ہنگامہ آرائیوں اور شورش انگیزیوں سے آپ فساد تو برپا کر سکتے ہیں لیکن قوم میں صحیح انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قوم کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا نہ کی جائے۔ اور یہی وہ جہاد ہے جس میں یہ گذشتہ

بیس سال سے مسلسل مصروف ہیں اور جس کے نتائج بحمداللہ بڑے خوشگوار ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس جہاد کو بغیر کسی خارجی امداد کے تنہا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس جنگ میں ان کی قوت کا راز قرآن مجید کی محکمیت اور اکملیت اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت و عظمت پر ان کا یقینِ محکم ہے۔ جس کی ایک جھلک آپ نے اُن کے آج کے خطاب میں بھی دیکھ لی ہے۔

قرآنِ مجید فطرت کے قوانین کی طرح تمام نوعِ انسان کے لئے کھلا ہوا ضابطہ حیات ہے جس طرح فطرت اپنے حقائق کے منکشف کرنے میں کوئی بخل نہیں برتتی۔ جو بھی اس کی نقاب کشائی کے لئے ہاتھ بڑھائے، عروسِ فطرت مسکراتی ہوئی بے حجابانہ اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کی یہ کتاب عظیم بھی اپنی رہنمائی میں مَا اور شُما میں کوئی تفریق نہیں کرتی ــــ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ــــ خدا کا ارشاد ہے، یعنی جو بھی ہمارے بارے میں جدو جہد کرے گا، ہم اسے اپنی طرف آنے والے راستے دکھا دیں گے۔ شرط صداقت کے ساتھ جدو جہد کی ہے اور بس ۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

لیکن کسی جدید راستے کی تلاش تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان اس راستے کے غلط ہونے کا احساس کرے جس پر وہ چلا جا رہا ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں وضاحت سے بتایا ہے، اِس وقت اقوامِ عالم کا ہیجان و اضطراب اس امر کی بشارت دیتا ہے کہ وہ اپنے موجودہ راستوں کی صحت کے متعلق غیر مطمئن ہو چکے ہیں۔ اس لئے وہ ان کی جگہ ایک جدید راستے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور چونکہ وہ اپنے ذہن کے تراشیدہ راستوں کو ایک ایک کرکے آزما چکے ہیں، اس لئے اب امید کی جا سکتی ہے کہ ان کا اگلا قدم اس راستے کی طرف اٹھے گا جسے قرآنِ مجید نے متعین کیا ہے اور جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا۔ ان لوگوں کا نوعِ انسان پر احسان ہے جو اس راہ گم کردہ قافلے کے لئے صحیح راستے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پرویز صاحب یقیناً ان افراد میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

میں پھر ایک بار اربابِ ادارۂ طلوعِ اسلام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس جلسے کی صدارت اور محترم پرویز صاحب کے عمیق خیالات سے مستفید ہونے کا شرف بخشا!

والسلام!

زندگی کے آخری دور میں وہ سیاست (بلکہ یوں کہیے کہ ہر قسم کی عملی کش مکش) سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور ہر چند وہ دور بڑی پریشانیوں کا تھا لیکن انہوں نے ان کا یہ حل تلاش کر لیا کہ اپنا سارا وقت قرآن مجید میں غور و فکر کے لئے وقف کر دیا، ان کا یہ جذب و انہماک کس طرح زندگی کے آخری وقت تک قائم رہا اس کا اندازہ آپ ان کے اس مکتوبِ گرامی سے لگا سکتے ہیں جو انہوں نے مجھے ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو

تحریر فرمایا۔ وھو ھذا

۶ر جنوری ۱۹۷۷ء

صدیق محترم المقام طول عمرکم و دام فیوضکم۔

آپ کی عنایات، نوازشات و کرم فرمائی کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ ۴-۵ روز ہوئے مطالب الفرقان کا عطیہ مل گیا اور پرسوں آپ کا عنایت نامہ بھی موصول ہوا۔ پہلی جلد میں پوری توجہ سے پڑھ رہا ہوں۔ ادھر ۳ مہینہ علالت کی وجہ سے پڑھ نہیں سکا۔ الحمد اور چند آیتوں کی تفسیر ہے مگر ہاں تصنیع عرض ہے کہ اپنا تاثر یہ ہے کہ قرآنی اصلاحی ہدایات کا ملخص ہے۔ اپنی کوتاہیوں پر حسرت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے فریاد ہے کہ چند روز جو زندگی کے رہ گئے ہیں ان میں تلافی مافات کی توفیق عطا ہو۔ یقین مانیئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو بدیر زندگی عطا ہو تاکہ آپ کا فیض جاری رہے۔ میں بفضلہٖ تعالیٰ اچھا ہوں۔ میری اور بیگم کی جانب سے سلام عقیدت قبول ہو۔

شکر گذار۔ شہاب الدین

کس قدر خوش بخت ہے وہ انسان جس کی، زندگی کے آخری لمحات تک، خدا کی کتابِ عظیم کے ساتھ اس قدر وابستگی میں گذرے ہوں۔ اور اس کے ساتھ، کس قدر حرماں نصیب ہے وہ شخص جو ایسے ہمراز و ہم نوا کی رفاقت سے محروم ہو جائے۔

فروغِ شمع جو اب ہے، رہے گا صبحِ محشر تک مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے!

اِس قسم کے رفقا کی ابدی جدائی سے جو احساسِ تنہائی پیدا ہوتا ہے، وہ بڑا جانسوز اور زہرہ گداز ہوتا ہے۔ مگر اسے بہرحال برداشت کرنا پڑتا ہے، اس یقین کے سہارے کہ ؎

مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں! وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ان کی یاد زندگی کا بہترین سہارا بنی رہتی ہے، اور اس یاد کے ساتھ یہ دعا وابستہ کہ ؎

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

مرحوم کے لئے اس دعا کے ساتھ، میری یہ دعا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ محترمہ بیگم شہاب صاحبہ، اور ان کے دیگر پس ماندگان کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جگر فگار

پرویز

خریدار متوجہ ہوں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے بعض خریدار ادارہ ہذا کو منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن کی پشت پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر درج نہیں کرتے۔ یہ لکھنا نہایت ضروری ہے۔

(ادارہ)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

نقد و تبصرہ

(قائدِ اعظمؒ اور علمائے ہند)

قیامِ پاکستان کے بعد سال ۱۹۷۶ء کو یہ فخر حاصل رہے گا کہ اسے قائداعظمؒ کا سال قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ پورے سال کے دوران قائدِ اعظمؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہزاروں مضامین اور مقالات لکھے گئے۔ جگہ جگہ تقاریر ہوئیں اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مجالسِ مذاکرہ منعقد ہوئیں لیکن ان تمام مقالات اور تقاریر میں آپ کی جدوجہدِ آزادی کے ایک اہم پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہ پہلو علماء کی جانب سے قائدِ اعظمؒ اور نظریۂ پاکستان کی مخالفت تھی۔ ۱۹۷۶ء کو قائداعظمؒ کا سال قرار دیتے ہی ان حضرات نے اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں اس سلسلے میں کس صورتِ حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تاریخی دستاویز تیار کی جو ماہنامہ الرشید کے دیوبند نمبر کی صورت میں شائع کی گئی۔ اس دستاویز میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ قائدِ اعظمؒ ہر کفر کے فتوے لگانے والے دیوبندی نہیں بریلوی علماء تھے۔ اس کے بعد ان کے کچھ فتوے نقل کئے ہیں جن میں قائدِ اعظمؒ کی طرف بڑے مکروہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ "د") پھر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستان کا قیام علمائے دیوبند کی کوششوں کا ثمرہ ہے (صفحہ س) اور ان میں سے جن حضرات نے اس کی مخالفت کی تھی وہ معمولی نوعیت کی تھی جس طرح کہ کسی منزل کی طرف جانے والے مسافر، سفر کے مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں (صفحہ ن) اس لئے آئندہ کبھی علماء کی پاکستان دشمنی کا نام نہ لیا جائے اور جو ایسا کرے گا وہ دینِ اسلام کا دشمن قرار پائے گا۔ (صفحہ ۱۲۷) علامہ اقبالؒ کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا علم غیر اسنادی تھا اور علمائے دیوبند کی کوششوں سے وہ صحیح اسلام کی طرف آ گئے۔ اور پھر انہوں نے اسلام کی خدمت کی۔ (صفحہ ۱۰۸)

یہ دستاویز جو ماہنامہ الرشید کے فروری اور مارچ ۷۶ء کے شماروں پر مشتمل ہے مئی کے مہینے میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اور اس کی اشاعت سے ان حضرات کا جو مقصد تھا وہ بخوبی حاصل ہو گیا کہ قائدِ اعظمؒ پر ہزاروں لکھنے والوں نے قائدِ اعظمؒ کے زندگی کے اس اہم واقعہ اور قیامِ پاکستان کی اس مخالفت کا ذکر تو کجا اس کی طرف معمولی سا اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ خیال تھا کہ کم از کم وہ دینی رسائل جو حکومت کی امداد سے

شائع ہوتے ہیں، حکومت کی پالیسی کے تحت اپنے ماہناموں کے قائداعظمؒ نمبر شائع کریں گے تو وہ اس دستاویز کا جائزہ لیں گے۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر انہوں نے قائداعظمؒ پر خصوصی نمبر شائع کرنے تو کجا آپ کی ذات سے متعلق کوئی تحقیقی مضمون بھی شائع نہیں کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس دستاویز کا جائزہ نہ لیا گیا تو کچھ عرصے بعد یہ ہماری تاریخ کا حصہ بن جائے گی۔ اس لئے ہم اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے اصل مسلک کو جسے وہ پردوں میں چھپانا چاہتے ہیں خود اسی دستاویز سے ان کے سامنے لائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے یہ مقصد کبھی نہیں رہا کہ برصغیر ہندو پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ انہی کے ایک عالم دین جناب اسرار احمد صاحب آزاد نے ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء کے اخبار مدینہ بجنور (انڈیا) میں یہ تحریر فرمایا کہ یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں سلطنتِ اسلامیہ کے لئے کوشاں رہے۔ اس کے برعکس دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اسلام کے سلسلے میں ان کا زیادہ سے زیادہ جو مطالبہ تھا اسے دارالعلوم کے موجودہ مہتمم قاری محمد طیب صاحب کی زبانی سنیئے:۔

> دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے، جب لٹن سے مسٹر مانٹیگو وزیر ہند آیا اور بادشاہ جارج (پنجم؟) کا زمانہ تھا تو میرے والد صاحب مولانا حافظ محمد احمد صاحب علماء کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لئے گئے۔ اور درخواست یہ کی کہ ہندوستان میں محکمہ قضا قائم کر دیا جائے، جس میں شریعتِ اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔ غیر اس نے ظاہر میں تو کہا کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور پارلیمنٹ میں بھی لیکن یہ ایک وقتی بات تھی۔ نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔ (صفحہ ۳۲۳)

ان حضرات کے نزدیک شریعتِ اسلامیہ غالباً انہی چیزوں تک محدود ہے۔ لیکن معلوم نہیں انہوں نے علامہ اقبالؒ کو جو صحیح اسنادی اسلام سکھایا تھا تو انہوں نے اس کے برعکس قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیوں پیش کر دیا!

یہ حضرات خود انگریزوں کی خدمت میں ایسی ایسی درخواستیں لے کر حاضر ہوتے رہے۔ لیکن جب مسلم لیگی لیڈروں نے انہی انگریز حکمرانوں سے مسلمانوں کے لئے حقوق حاصل کرنے کے لئے ملاقات کی تو انہیں انگریزوں کا ایجنٹ اور ان کی جماعت کو انگریزوں کی ایجنسی قرار دے دیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اب بھی ان حضرات کے یہی خیالات ہیں۔ چنانچہ دستاویز زیر تبصرہ میں اس بارے میں یہ تحقیق پیش کی گئی ہے کہ:۔

> ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی ابتداء ہوئی۔ اس میں مسٹر ماریشن، مسٹر بیک اور مسٹر ارجیو بالترتیب پرنسپل رہے۔ حالات پر ان کا کنٹرول تھا، انہی کی سیاست کارفرما تھی، آخر الذکر نے

مشہور شملہ وفد کا اہتمام کیا، جس نے وائسرائے بہادر سے مل کر حقوق چھیننے کی خودمدارانہ راہ کی بجائے مانگنے کی بزدلانہ روش کی ابتداء کی۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو یہ وفد شملہ میں ملا۔ اگلے ہی دن لنڈن کے اخبارات خوشی سے اچھل پڑے۔ انہوں نے تعریف و توصیف میں زمین، آسمان کے قلابے ملائے اور اس کے چند دن بعد ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء کو مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اس کے اغراض و مقاصد اتنے افسوس ناک تھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سرکار کی کوئی ایجنسی ہے۔ جو "فرائضِ مخصوصہ" سرانجام دینے کے لئے معرضِ وجود میں آئی ہے[1] (صفحہ ۶۳۸)

ان حضرات کی حقوق چھیننے کی خودمدارانہ درخواست کی ایک جھلک قارئین کے سامنے ابھی ابھی گذر چکی ہے لیکن اس کے باوجود مسلم لیڈروں کے اس سے زیادہ قابلِ اعتماد کارنامے کو وہ انگریزوں کی سازش قرار دیتے ہیں اور مسلم لیگ کو ..... انگریزوں کی ایجنسی۔ یعنی کسی زمانے میں جو یہ حضرات اعلان فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان انگریزوں کی سازش کا نتیجہ ہے تو وہ چیز ابھی تک ان کے دماغ کے کونوں کھدروں میں موجود ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ آج کے پاکستان میں انہیں خان عبدالغفار خان صاحب سب سے زیادہ مظلوم دکھائی دیتا ہے جس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:-

سرحد کا یہ مظلوم رہنما، شیخ الہند کے مرید اور معتمد ساتھی کا طویل عرصہ جیلوں میں گذرا اور اب بھی نظر بند ہے۔ (صفحہ ۶۶۳)

قائداعظمؒ کی ذات اور اسلام سے ان کی وابستگی پر جو حملے ان کی جانب سے ہوتے رہے، تاویلات کے باوجود انہیں اس بارے میں اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ پہلے تو یہ کہ اس کا رُخ انہوں نے اپنے مخالف فرقے بریلوی کی جانب موڑ دیا اور ساتھ ہی ان کے وہ فتوے بھی نقل کر دیئے جس میں انہوں نے قائداعظمؒ پر کفر کے فتوے لگانے کے ساتھ ساتھ ان پر کیچڑ بھی اچھالا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ان کا جی نہیں بھرا۔ اس لئے دعویٰ کیا کہ "کفر کا فتویٰ لگانا ان کے مسلک کے خلاف ہے۔ انہی کے الفاظ ہیں:-

اکابرِ دارالاسلام کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ یہ بزرگ مسلمانوں کو کافر بنانے کے لئے نہیں، کافروں کو اسلام میں لانے کی علمی، فکری اور عملی جدوجہد کرتے رہے۔ تکفیرِ مسلمین کا مشغلہ اساسی طور پر ان کے فکر و عمل سے ٹکراتا ہے[2] (صفحہ ۴۴۶)

لیکن چند ہی صفحات بعد پرویز صاحب پر کفر کا فتویٰ جڑنے پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اس اصول کی

---

[1] ان حضرات کو نہ تو ۱۹۳۷ء والی مسلم لیگ نظر آتی ہے اور نہ ہی یہ حقیقت کہ ان کی چہیتی جماعت (کانگرس) کی بنیاد تو خود ایک انگریز (مسٹر ہیوم) نے رکھی تھی! اسے کہتے ہیں تعصب کی پٹی! (طلوعِ اسلام)

[2] یہ انہیں یاد نہیں رہا کہ مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب دیوبندی نے مولوی احمد رضا خان بریلوی کو کافر، اکفر، دجال مأۃ حاضرہ، مرتد، خارج از اسلام قرار دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو رسالہ ردِ تکفیر لی الفحاش التنظیر)

دھجیاں یوں بکھیرتے ہیں :-

پھر تمام اکابرین کا متفقہ فتویٰ کہ پرویز کافر ہے کل کی بات ہے۔ (صفحہ ۴۶۴)

بایں ہمہ، غنیمت ہے کہ انہوں نے ایک بہت بڑی تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ مولانا حسین احمد مدنی ہندو کانگرس کے چوٹی کے لیڈروں میں تھے۔ (صفحہ ۵۰۴) کیونکہ ان حضرات کی جانب سے پاکستان کے خلاف جو مہم چلائی گئی تھی وہ انہی کی نگرانی میں تھی۔ انہوں نے اس حقیقت کا تو انکار نہیں کیا لیکن ان کے کانگریسی لیڈر ہونے اور پاکستان کی مخالفت کے اثرات سے بچانے کے لئے انہیں اس دستاویز میں بطور ایک ولی اللہ پیش کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ :-

گرمی ہوتی تو ان کے سر پر بادل کا سایہ ہو جاتا تھا۔ اور وہ بارش میں چلتے تھے تو ان پر پانی کا ایک قطرہ نہیں پڑتا تھا وغیرہ۔ (صفحہ ۵۶۳)

یہی نہیں بلکہ انہوں نے دیوبند کے مدرسے کی بابت بھی یہ اعلان کیا ہے کہ :-

وہ ایک الہامی مدرسہ تھا جس کی بنیادوں کے نشانات خود رسول اللہ صلعم اپنے مبارک ہاتھوں سے لگانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اور آپ (صلعم) کے لگائے ہوئے نشانات پر اس کی بنیادیں کھودی گئیں رکھیں اور عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ (صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹)

اور سب سے دلچسپ بات یہ کہ اس آٹھ سو صفحات کی دستاویز میں یہ ذکر تو موجود ہے کہ پاکستان علمائے ہند کی کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن اس سلسلے میں قائداعظمؒ کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ اب ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ بعد جب یہ دستاویز ہماری "تاریخ" کا جزو بن جائے گی تو اس وقت ہماری نئی نسل کا ایک کثیر حصہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگا کہ مسلم لیگ انگریزوں کی ایجنسی اور اس کے لیڈر انگریزوں کے ایجنٹ تھے اور پاکستان بنانے والے علمائے دیوبند تھے۔ اور پھر کون ہوگا جو اس کی تردید کر سکے گا؟

قراردادِ تعزیت

بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کا یہ ہنگامی تعزیتی اجلاس، منعقدہ ۴ فروری ۱۹۷۷ء اپنے دیرینہ اور مخلص رفیقِ محترم محمد آصف حسین صاحب کی ناگہانی اور بے وقت رحلت پر گہرے رنج و صدمہ کا اظہار کرتا ہے۔

مرحوم قرآنی تعلیمات کے چلتے پھرتے پیکر تھے اور ان کا شمار بنیادی بزم کے بانی ارکان میں ہوتا تھا۔ ان کی خدماتِ جلیلہ جو انہوں نے قرآن کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لئے سرانجام دیں۔ ہم جملہ احباب کے لئے مشعلِ راہ رہیں گی اور ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر کرنا مشکل ہے۔

ہم جملہ اراکینِ بزم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس کے پاک گوشے میں نشیمن عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل۔

نجابت خاں
نمائندہ بزم۔ راولپنڈی

ادارۂ طلوعِ اسلام، بزمِ راولپنڈی کے ساتھ اس صدمہ میں برابر کا شریکِ غم ہے۔ مرحوم، ہماری قرآنی تحریک کے لئے متاعِ گراں بہا تھے۔

طلوع اسلام کنونیشن ۱۹۷۶ء

بزمِ مذاکرہ

(قسط دوم)

(بزمِ مذاکرہ ۱۹۷۶ء کی قسط اوّل، طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اب قسط دوم پیش خدمت ہے۔)

۵- ثریا عندلیب

صدرِ محترم۔ عزیز بہنو اور بھائیو۔ السلام علیکم!

حکیم الامت علامہ اقبالؒ رحمۃ اللہ علیہ کو رب العالمین کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ نہ جانے ہماری اس شوریدہ بخت قوم کی کونسی نیکی یا کونسا حسنِ عمل مشیت الٰہی کے مطابق ہو گیا کہ اس کی جزا میں ہمیں وہ دیدہ ور نصیب ہوا جس کا کلام ترجمان القرآن زندگی کے ہر دور میں ماضی، حال، مستقبل کے ہر زمانے میں ہماری رہبری کرتے ہوئے ہماری ڈولتی ڈوبتی کشتی کا ناخدا بنتا رہتا ہے۔

لاریب! خدا کے کلام کی صحیح تشریح کرنے والا انسانی کلام ہی ہماری رہنمائی کرنے کا حق رکھتا اور ہمیں تباہی سے بچا سکتا ہے۔ گذشتہ سالوں کی طرح امسال بھی اپنی طلوعِ اسلام کنونشن میں ہم حسبِ توفیق فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں اپنا سالانہ معاشرتی جائزہ لینے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے مذاکرے کا موضوع کلامِ اقبالؒ سے ہی منتخب کیا جاتا ہے۔ اس دفعہ موضوع کی مناسبت سے ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس گہری سازش کو بے نقاب کریں جو دیگر کئی سازشوں کی طرح صدیوں سے ہماری جڑیں کھوکھلی کرتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی یہ کہ ہماری قوم کے زوال کا سبب ہماری مفلسی و ناداری ہے۔ یہ وہ باطل مفروضہ ہے جس کو خواص کے گروہ نے مفادِ خویش کی خاطر حیلۂ ابلیسی سے عوام کے اذہان میں پیوست کر دیا لیکن اس مفکرِ قرآن کی فراستِ ایمانی اور دانش برہانی اس ابلیسیت پر تڑپ اٹھی، اس نے پکار کر کہا کہ:-

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اپنے موجودہ معاشرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے آج ہم نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس سچائی کو ثابت کرنا ہے کہ بندۂ مومن یعنی امت مسلمہ کا زوال بے زری سے نہیں ہوتا۔ مفلسی اس کا سبب نہیں بنتی۔ اس کا

سبب کچھ اور ہے۔ اور وقت کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ اس حقیقت کو خود سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا جائے کہ قوم کے زوال کا باعث بے زری نہیں بلکہ وہ زرداری ہوتی ہے جو دوسروں کو زر سے محروم رکھتی ہے۔

اگر ہم صدرِ اوّل کے عہدِ مبارک کو چھوڑ کر اپنے ماضی کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہوئے حال کے واقعات پر آئیں تو ہمیں ان تمام ادوار میں وہ بنیادی خرابی نظر آئے گی جسے طبقاتی نظام کہا جاتا ہے۔ جس میں اونچ نیچ کی تقسیم کی جاتی ہے، مال و دولت کی بنا پر۔ یوں مال و دولت والے، خواص کا ایک گروہ بن کر اونچے طبقے سے موسوم ہوتے ہیں۔ یہ خواص اپنی اس دولت کی بدولت جو لوٹ کھسوٹ اور استحصال و استبداد کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ ہر قسم کا اقتدار و اختیار حاصل کر کے من مانیاں کرتے ہیں اور اپنے بچاؤ اور استحکام کی خاطر معاشرے میں باطل خیالات اور غلط مفروضات کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں پیچھے سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد جس قدر دولت سمیٹتا ہے وہ اسی حساب سے انسانوں کو اس سے محروم کر دیتا ہے جیسے جیسے دولت چند انسانوں کے پاس جمع ہونی شروع ہو جاتی ہے تو اسی نسبت سے عام افرادِ معاشرہ اس سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں لازماً اس کا نتیجہ معاشرہ کی وہ ناہمواریاں ہوتی ہیں جن سے مختلف مفاسد وجود میں آتے ہیں جو قوم کو ذلت کی پستیوں میں دھکیلنے کا موجب بنتے ہیں۔ یہ دولت والے نہیں جاننا چاہتے کہ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں۔ اور اس کا مقصد تبھی پورا ہوتا ہے جب اسے گردش میں رکھا جائے مگر قرآنِ حکیم کی اس ہدایت کے ساتھ کہ دولت کی یہ گردش اوپر کے طبقے میں ہی نہ ہوتی رہے بلکہ اسے پورے کے پورے معاشرے کے رگ و پے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔

اس کے علاوہ دولت مند طبقہ ہمیشہ اس زعم میں رہتا ہے کہ دنیا بھر کی عقل و فکر کے واحد مالک اور سمجھ بوجھ کے اجارہ دار وہی ہیں۔ ان کے نزدیک غریب کے پاس نہ تو عقل ہوتی ہے نہ تمیز۔ وہ اس کی مفلسی کو اس کی بے وقوفی اور بے سمجھی کا نتیجہ گردانتے ہیں اور اس کی ناداری و محتاجی کو قوم کی پستی و ذلت کا سبب ٹھہراتے ہیں جبکہ سارا قصور ان کے خود ساختہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام کا ہوتا ہے۔ جس کی چھاؤں میں یہ خود امیر سے امیر تر ہوتے چلے جاتے اور غریب کو غریب تر کئے چلے جاتے ہیں۔ پھر یہ اونچا طبقہ اپنے بے حد و حساب سرمائے کے تحفظ اور اپنی دن رات کی عیش سامانیوں کو برقرار رکھنے کے لئے یہ کہہ کہہ کر دنیا کو فریب دیتا اور دھوکے میں رکھتا ہے کہ دیکھنا ذرا! اس چھوٹے طبقے کے ان نیچ کمی لوگوں نے بداخلاقیوں اور قانون شکنیوں سے کیسی ابتری پھیلائی ہوئی ہے۔ تعلیم و تربیت سے یہ بیگانے ہیں۔ سوسائٹی کے آداب کا ان کو شعور نہیں۔ بچے ان کے ننگ دھڑنگ گلیوں میں ادھم مچاتے پھرتے ہیں۔ جہالت و غلاظت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ توبہ ہے جی! ان کم بختوں نے تو ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔ انہی کے بے مایہ وجود سے تو باہر کی دنیا میں ہماری تذلیل ہو جاتی ہے —— عزت و وقار سے ہمیں محروم رہنا پڑتا ہے۔ یوں یہ بڑے لوگ اپنے بڑے بڑے جرائم کو چھپانے کے لئے چھوٹے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو اچھال اچھال کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام کر دکھایا۔ ہم

نے میدان مار لیا ہے

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات

حکیم الامت کے اس قولِ صادق سے کوئی قلبِ سلیم کوئی اہلِ رشید انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ان زرداروں کو اپنے نشۂ اقتدار کی بدمستی میں اپنی وہ سنگین ناانصافیاں نظر نہیں آتیں جن کی وجہ سے مفلس و بے زر لوگوں سے مجبوراً وہ خرابیاں اور بداخلاقیاں سرزد ہوتی ہیں جن سے وہ بھوکے پیٹ کے لئے روٹی مہیا کرتے ہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ چھوٹے پیمانے پر ہونے والی ان خرابیوں سے قومیں ڈوبتی نہیں۔

سامعینِ عزیز! تاریخِ انسانیت اس کی شاہد ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محض غریبوں اور ناداروں کے ہاتھوں قوموں کی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ برعکس اس کے آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس باب میں کس قدر واضح احکام اور یہ ہدایات دی ہیں وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

جو لوگ سونا اور چاندی یعنی دولت جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ یعنی انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے کھلا نہیں رکھتے، خرچ نہیں کرتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔

قرآن کہتا ہے کہ مفادِ خویش کے لئے دولت جمع کرنا اور تجوریوں کے منہ بند رکھنا انسانیت کے خلاف جرمِ عظیم ہے جو ایسا کرتے ہیں وہ یاد رکھیں:۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ

جس دن سیم و زر کے ان ٹکڑوں کو جو یہ جمع کر رہے ہیں جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغ دیا جائیگا۔

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ

اور اُن سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جمع کر رکھا تھا۔

فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔

سو تم اپنی جمع کردہ دولت کے عذاب کا مزہ چکھو۔

یہ ہے وہ زرداری جس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے یہ اٹل فیصلہ دے دیا کہ یہ ہرگز کسی اوج کمال تک نہیں پہنچاتی بلکہ سراسر زوال و عذاب کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی کی روشنی میں معاشرے کے حالات پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ۔ ع

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کوئی چھپا ہوا بھید نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے جبکہ اس مردِ دانا نے یہ بھی کہہ دیا کہ۔ تو جس کو خود سمجھنا ہے۔ لیکن جب سمجھنے والا خود بے ایمانی پر اتر آئے اور نظر بظاہر دانشور

کہلائے تو۔ ع

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

بات ساری یہ ہے کہ دولت۔ قوت۔ اقتدار اور حکومت کا نشہ انسان کو اپنے آپ میں نہیں رہنے دیتا۔ پھر اسے نہ کسی قانون قاعدے کی پرواہ ہوتی ہے نہ کسی اخلاقی ضابطہ یا انسانی قدر کا احترام۔ چونکہ قانون اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لئے وہ کسی ایسی قوت کو تسلیم ہی نہیں کرتا جو اس کی بے راہروی پر گرفت کر سکے۔ اس کیفیت میں ایسے لوگوں کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ ان سے بھی کوئی باز پرس کرنے والا ہے۔ حالانکہ خدا کا قانونِ مکافات ان کی گھات میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ تو نہایت اطمینان سے اپنی سرکشی اور جرائم پیشگی میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس خود فریبی میں رہتے ہوئے کہ ہماری اس روش سے قوم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کی تو ساری ذمہ داری ان غریب غربا پر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور مکافاتِ عمل کی محکم گرفت انہیں اس طرح اچانک دبوچ لیتی ہے کہ ان کے ذہن ہی میں نہیں آتا کہ ہوا کیا۔

فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔

یہ عذاب ایسے مقام سے آتا ہے جو ان کے سان گمان میں بھی نہیں ہوتا

وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ

وہ اسے دیکھ کر بھاگنا چاہتے ہیں لیکن انہیں ——— آواز دی جاتی ہے کہ

لَا تَرْكُضُوْا۔ مت بھاگو، تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوْا إِلٰى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسَاكِنِكُمْ۔ تم پلٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر اپنے عیش و عشرت کا سامان اکٹھا کیا تھا۔ چلو انہی محلات میں جن کی تزئین و آرائش غریبوں کے خونِ جگر کی رنگینی سے کی گئی تھی۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ۔ چلو وہاں۔ تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا، تم سمجھتے تھے کہ تمہیں تمہاری ظلم کوشیوں اور عیش سامانیوں کے متعلق کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ آج تم سے ان سب کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم دولت کے انبار در انبار اکٹھے کرتے چلے جاتے تھے۔ بجائے اس کے کہ تمہیں ارتکابِ جرائم پر شرم آئے تم اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں پر خوشیاں مناتے تھے اور اپنے غنڈے پن پر فخر کرتے تھے۔ سیٹھ عابد بن کر معاشرے میں دندناتے پھرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ یونہی چلتا رہے گا۔ بدکرداروں اور بدمعاشوں والے کام کرتے تھے لیکن معاشرے میں بڑے شریف اور معزز بنے رہتے تھے۔ ان بداطواریوں کے نتیجے میں جب زوال کی گھڑی تم پر مسلط ہو گی تو تمہارا حقیقی چہرہ جس پر ذلت اور رسوائیوں کی سیاہی چھا رہی ہے، سب کے سامنے بے نقاب ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ عبرت انگیز نقشہ جو قرآنِ کریم کی آیات بینات میں بیسیوں جگہ نظر آتا ہے۔ ان مالداروں اور دولتمندوں کے انجام کا جن کو ہوسِ دولت کی بدمستی میں اپنے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جن کا کام غریب محنت کشوں کی کمائی چھین چھین کر اپنے گھر بھرنا ہوتا ہے

جو اپنی کمائی میں حاجتمندوں کا حصہ نہیں رکھتے اور حق داروں کا حق ادا نہیں کرتے۔ جن کو اپنا یہ فریضہ کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آتا کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کی روزی کا بندوبست کریں۔ جو باوا کی میراث سمجھ کر سیم و زر سے اپنے خزانے بھرتے چلے جاتے ہیں لیکن عوام کی حاجت برآری اور بہبودی کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اب ہمیں کون آکر یہ بتائے گا کہ جب کسی معاشرے کی یہ صورتِ حال ہو جائے تو پھر اس کے زوال کے اسباب ڈھونڈنے کے لئے کہیں باہر نہیں جانا پڑتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا۔

یاد رکھو! جو معاشرہ ظلم و سرکشی سے ایسی روش اختیار کرے گا وہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔

چونکہ اس قسم کا ظلم و جور انہی لوگوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں جن کا جتھہ یا پارٹی کوئی نہ ہو اس لئے اسے خاص طور پر دہرایا گیا کہ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ ظلم و زیادتی سے معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے بے بس و بے کس لوگوں کا مال کھا جانے والے ظالم اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ اس باطل نظام میں ایک گروہ اپنا سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت غصب کرتا ہے تو دوسرا گروہ سرمایہ تک بھی نہیں لگاتا اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ گروہ ہے مذہبی علماء اور روحانی پیشواؤں کا جن کی تصریح قرآن کریم نے ان الفاظ میں کر دی کہ:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

اے جماعتِ مومنین! (ان مذہبی عالموں اور روحانی پیشواؤں سے ہوشیار رہو) یہ الّا ماشاء اللہ، وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا مال باطل طریق پر کھا جاتے ہیں۔ عوام بے چارے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے دعوت دینے والے لوگ ہیں، حالانکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے، اس کی وضاحت آگے چل کر یوں کر دی کہ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خود ساختہ مسلک کو شریعتِ خداوندی کا نام دے کر لوگوں کو خدا کے سیدھے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ آخرت پر ان کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے مذہب کو بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہ ظالم ہیں جن پر خدا کی لعنت برستی ہے۔ (۱۱/۱۷-۱۹) اس طرح یہ لوگ دین میں اختلافات پیدا کر کے امت کو فرقوں میں تقسیم کر دیتے ہیں یہ وہ ظلم ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور کیا اس چوکھٹے کے اندر ہماری قوم، اس موجودہ نام نہاد امت مسلمہ کی تصویر فٹ نہیں بیٹھتی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تفصیل کے اعتبار سے زوالِ اُمت کے بہت سے اسباب سامنے آتے ہیں لیکن

بنیادی طور پر اس کا صرف ایک سبب ہے اور وہ ہے مذہب جس نے خدا کے عطا کردہ دینِ مبین کی جگہ لے لی اور دین اسلام کو مذہب اسلام بنا دیا۔ اس خود ساختہ مذہب نے جو درگت ماضی میں ہماری بنائی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس مذہب کے اجارہ داروں کے ہاتھوں حال میں جو کچھ امتِ مسلمہ کے ساتھ ہو رہا ہے وہ بھی سب پر سورج کی طرح عیاں ہے۔ یوں آج ایک طرف مسلمان کی دنیا معاشی زندگی کی تمام ناہمواریوں میں گھری ہوئی ہے تو دوسری طرف اس کی آخرت مذہب کی تاریکیوں میں چھپی ہوئی شریعت کے رسوم و مروجات۔ علم کلام کے فنظری مباحث۔ تصوّف کی فضول کاریاں سب انہی تاریکیوں کے پیدا کردہ چھلاوے ہیں اور ان کے اندر جکڑا ہوا بے چارہ مسلمان حسرت بھری نگاہوں سے دوسری قوموں کو دیکھتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟

آں کہ گوید لا الٰہ بے چارہ ایست　　فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر　　سود خوار و دالی و ملّا و پیر!

اس ذہنی اور جسمانی استکراہ و استبداد کے بعد سینہ میں روشنی کی کرن کہاں سے آ سکتی ہے۔!!

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

یوں تو مذہب کی طرف سے لایا ہوا ہر نظریہ اور ہر تصوّر تباہی و بربادی کا پیغام بر ہوتا ہے لیکن ان میں سے عقیدۂ تقلید کے اثرات سب سے زیادہ تباہ کن اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ ثبوت کے لئے ہماری قوم موجود ہے جس کی تقلید پرستی کا اس ترقی یافتہ دور اور روشن ترین زمانے میں بھی یہ عالم ہے کہ کہیں اور اس کی مثال نہیں ملتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ آخر انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے۔ عقل ہی ان دونوں کے درمیان نشانِ امتیاز بنتی ہے نا۔ چنانچہ جس نظریۂ زندگی میں عقل کو سلب کر دیا جائے اس کی رو سے انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عقل و دانش سے کام نہ لینے والوں کو شر الدواب بدترین خلائق اور حیوانات سے بھی گئے گذرے قرار دیا ہے۔ قرآن نے اسلاف کی کورانہ تقلید کرنے اور اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے۔ انسانیت کا ارتقا، علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ——— ماحول کی رکاوٹیں اور مشکلیں ہوتی ہیں جنہیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیقِ مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔ جیسا کہ اقبالؒ کہتا ہے ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی، بلکہ مٹی اور پتھر کا جامد ڈھیر بن جاتی ہے، اسی کو زوال کہتے ہیں اور جہانِ نو تعمیر کرنے والی قوم کو مٹی اور پتھروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن ارتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے اور مذہب آنے والی نسلوں کو اسلاف کی تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر بڑھنے والی انسانیت کو وہیں روک دیتا ہے بلکہ پیچھے کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ تقلید سے رسومِ کہنہ کے طوق و اغلال اس بُری طرح گردن کو جکڑے رہتے ہیں کہ ان سے گردن اوپر کی اوپر اٹھی رہتی ہے اور انسان کو اپنے سامنے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس مقام پر میں یہ پوچھنے کی جرأت کرتی ہوں کہ دینِ خداوندی کو چھوڑ کر ہم نے جو پیشوائی مذہب اختیار کر رکھا ہے اس سے کیا ہمیں اپنے سامنے کا راستہ یعنی صراطِ مستقیم نظر آتا ہے؟؟ ہماری تو یہ حالت ہو چکی ہے کہ :-

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و مُلّا ئے ما محرومِ شوق

جب اذہان اس طرح تاریکیوں میں گھر جائیں تو عروج و ارتقاء کی راہیں کیسے نظر آئیں گی، پھر تو زوال کے گہرے اندھیرے ہی اپنا مقدر بنیں گے۔ بہرحال ابھی وقت ختم نہیں ہو گیا۔ ابھی ہم زندہ ہیں، اور اس زوال کو عروج میں بدل سکتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں اس خود ساختہ مذہب اس باطل نظام کو چھوڑ کر دینِ خداوندی اختیار کرنا ہوگا جس میں قرآنی نظام کے قیام سے ہمیں قریبی مفاد بھی اس انداز کے حاصل ہوں گے کہ دنیا کی دوسری قومیں اس پر رشک کریں اور اس کے بعد مستقبل بھی ایسا روشن اور تابناک ہوگا کہ :-

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا.

یعنی یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی

قرآنِ کریم کا یہ وعدہ ہے کہ :-

إِلَّا مَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا.

لیکن اس کے بعد بھی جو قوم پھر پچھلے پاؤں لوٹ جائے اور اصل راستے پر پہنچ کر پھر وہ نظامِ عمل اختیار کر لے جس کا نتیجہ زندگی کی ہمواریاں ہیں تو یہ قوم پھر اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پا لے گی۔ اور پھر ان کی کوششیں اپنا پورا پورا نتیجہ پیدا کرنے لگ جائیں گی۔ مگر کونسی فردوسِ گم گشتہ؟ وہ ہمیشہ رہنے والی جنت جس کی بہار میں خزاں نہیں اور جس کا وعدہ خدائے رحمان نے اپنے بندوں سے لے کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق کوششوں کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔ یقیناً اس کا وعدہ یعنی قانون کا نتیجہ ایسا ہے جیسے ایک بات وقوع میں آ گئی۔ تو سامعینِ کرام امتِ مسلمہ کے زوال اور اس کے علاج کے متعلق یہ ہے میری صوابدید جو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں میں نے آپ کے سامنے پیش کی۔ شکریہ!

والسلام

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر اتوار ساڑھے ۹ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**لیّہ** میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔ کیپٹن غلام حیدر خاں کے مکان (نمبر ۲۵۱ وارڈ ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)
ملتان میں ہر جمعہ ساڑھے ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) فون ۲۰۷۱ دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ	**لائلپور** میں ہر جمعہ ساڑھے ۸ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۲۹۴) ۶۵ کوتوالی روڈ حیات سرجیکل کلینک
گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/۱ بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**کراچی** میں ہر اتوار ساڑھے ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوعِ اسلام ۔ دار القائد (فون ۶۱۰۴۲۸) ۲۰۔ ایر بی ۔ ناظم آباد ۳
جام پور میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازی خاں) بلوچ جنرل اسٹورز۔ اڈہ روڈ	**راولپنڈی** میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	**کوئٹہ** میں ہر جمعہ ساڑھے ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) مکان نمبر ۱۹/۱۴۴ عبدالستار روڈ (نزد گرین ہوٹل)

کیا تنہا عقلِ انسانی وحی کی مدد کے بغیر زندگی کے بنیادی مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟

اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر تک کے مفکرین، مؤرخین، علمائے اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات، سیاست اور ماہرینِ علم سائنس کی تحقیق کی رو سے، محترم پرویز صاحب کی کتاب۔

انسان نے کیا سوچا؟

میں مل جائے گا، جو آپ کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی اور آپ کے سامنے یہ حقیقت بھی واشگاف ہو گی کہ عقلِ انسانی کو وحی کی ضرورت کیوں ہے۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلد ۔/۲۰ روپے۔

(علاوہ محصول ڈاک)

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور